شب براءت کیا ہے؟

شب براءت کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ جس میں اس موضوع کی روایات پر سیر حاصل تبصرہ کر کے اصل حقیقت واضح کی گئی ہے۔

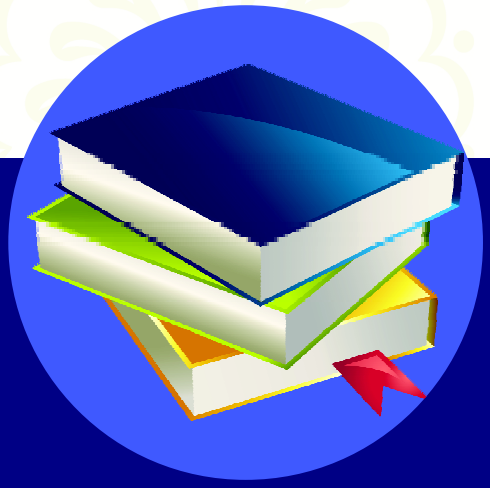

تالیف: علامہ حبیب الرحمان صدیقی کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

اعداد و تبصرہ

محمد فہد حارث

حارث پبلیکیشنز

شب براءت کیا ہے؟

شب براءت کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ جس میں اس موضوع کی روایات پر سیر حاصل بحث کر کے اصل حقیقت واضح کی گئی ہے۔

تالیف

علامہ حبیب الرحمان صدیقی کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ

اعداد و تبصرہ: محمد فہد حارث

حارث پبلیکیشنز

haris.publications@gmail.com

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
۱	تبصرہ	۳
۲	تعارف	۷
۳	تقریظ	۹
۴	شب براءت یا شب تبراء	۱۲
۵	لیلۃ مبارکہ کی تفسیر	۱۸
۶	حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ارشادات کی حقیقت	۲۴
۷	عثمان بن المغیرہؓ کی روایت	۲۸
۸	بقیع کی کہانی	۳۱
۹	حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت	۴۳
۱۰	حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت	۴۵
۱۱	شعبان میرا مہینہ ہے	۴۹
۱۲	ایک دعا	۵۲
۱۳	حضرت انسؓ کی ایک روایت	۵۵
۱۴	شب براءت کا روزہ	۵۶

۱۵	محدثین اور فقہاء کے تبصرے	۵۹
۱۶	آتش بازی یا کہ آتش پرستی	۷۶
۱۷	حلوے مانڈے	۸۱

تبصرہ

ویسے تو شب براءت کے موضوع پر کئی کتب تصنیف کی گئی ہیں، جس میں اس رات کے وضعی ہونے سے متعلق عمدہ و مفصل کلام کیا گیا ہے لیکن اس بابت ہم کو جو کتاب سب سے زیادہ پسند ہے وہ علامہ حبیب الرحمٰن کاندھلوی صاحب کا کتابچہ ''شب براءت کیا ہے؟'' جو کہ ان کی ۵۷۸ صفحات پر مشتمل مفصل کتاب ''شب براءت ایک تحقیقی جائزہ'' کا ۸۸ صفحات پر مشتمل خلاصہ ہے۔ کاندھلوی صاحب کی یہ مفصل کتاب بھی ہم نے پڑھی ہوئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر اس سے زیادہ شاندار اور مفصل کتاب ہماری نظروں سے نہیں گزری جس میں شعبان سے متعلق ایک ایک روایت پر کلام کیا گیا ہے جس نے اس کتاب کی ضخامت کو تقریباً ۶۰۰ صفحات تک پہنچا دیا ہے۔ اس ہی کتاب کا خلاصہ زیر تبصرہ کتاب ''شب براءت کیا ہے؟''۔ یہاں ہم یہ وضاحت بھی کر دیں کہ یہ کتابچہ اپنی ابتدائی شکل میں ''فضائل شعبان المعظم'' کے نام سے چھپا تھا جس کو مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع، علامہ محمد یوسف بنوری اور دوسرے علمائے اہلسنت کی تائید حاصل ہوئی تھی۔

کتاب ''شب براءت کیا ہے؟'' پر مشہور حنفی عالم جناب علامہ شیخ محمد جعفر شاہ پھلواری کی تقریظ موجود ہے جس میں انہوں نے اس کتاب پر علامہ کاندھلوی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کے علم الحدیث میں ماہر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ کتاب ہٰذا میں کاندھلوی صاحب سب سے اول مبحث مرکب ''شب براءت'' کے معنی پر بحث کرتے ہوئے لاتے ہیں جہاں وہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں اس نام سے کوئی رات موجود نہیں بلکہ یہ فارسی اور عربی کو ملا کر بنایا گیا ایک مرکب اضافی ہے جس میں شب فارسی کا لفظ اور براءت عربی کا لفظ ہے۔ اس کے بعد کاندھلوی صاحب ''براءت'' کے لفظ پر بحث کرتے ہوئے ثابت کرتے ہیں کہ یہ لفظ براءت بری سے بنا ہے جس کا مصدر متعدی تبرا ہے اور عربی زبان میں یہ

تمام الفاظ نفرت و بیزاری کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔اس بابت وہ قرآن وحدیث سے کئی مثالیں دیکر اپنی بات سمجھاتے ہیں اور آخر میں اصل مدعا سامنے رکھتے ہیں کہ دراصل یہ رات روافض کی ایجاد کردہ ہے جن کا یہ ماننا ہے کہ ان کے بارہویں امام مہدی اس رات کو پیدا ہوئے تھے، اسی رات کو غار میں پوشیدہ ہوگئے اور اسی رات کو دوبارہ ظہور فرما کر اس دنیا کو اہلسنت کے ''ناپاک'' وجود سے نجات دلائیں گے، ابوبکرؓ وعمرؓ کو ان کی قبروں سے نکال کر انہیں پھانسی پر لٹکائیں اور تمام بے دینوں یعنی اہلسنت مسلمانوں کو قتل کریں گے۔گویا یہ رات اصل میں تبرا اور اہلسنت سے بیزاری والی رات ہے۔

صفحہ ۱۸ پر کاندھلوی صاحب سورۃ الدخان کی آیت نمبر ۲ تا ۵ پر مفصل کلام کر کے ثابت کرتے ہیں کہ ان آیات میں جس رات کو لیلۃ المبارکہ کہا گیا ہے وہ ۱۵ شعبان نہیں بلکہ رمضان کی لیلۃ القدر ہے۔ سورۃ الدخان کی یہی تفسیر مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی اپنی تفسیر القرآن میں کی ہے۔کاندھلوی صاحب نے اس سلسلے میں سلف کے نام بھی پیش کئے ہیں جو کہ لیلۃ المبارکہ سے مراد لیلۃ القدر لیتے تھے جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ، سیدنا عبداللہ بن عمرؓ، امام سعید بن المسیبؒ، امام مجاہد، امام حسن بصری، ضحاک، زید بن اسلم، قتادہ، ابن العربی مالکی، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن دحیہ، ابن حجر، ابن کثیر، قرطبی، امام نووی اور دوسرے کئی اہل علم۔

آگے جا کر کاندھلوی صاحب سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کے اس قول پر کلام کرتے ہیں جو کہ عموماً اس رات کے قائلین پیش کرتے ہیں کہ جس میں مذکور ہے کہ لیلۃ المبارکہ ۱۵ شعبان کی رات ہے اور جرح و تعدیل کی روشنی میں سیدنا عبداللہ بن عباسؓ سے اس قول کی نسبت کو باطل ثابت کرتے ہیں۔اس سلسلے میں جو دوسری روایت پیش کی جاتی ہے وہ عثمان بن المغیرہ کی روایت ہے جس میں مذکور ہے کہ شعبان سے شعبان تک موتوں کا فیصلہ کیا جاتا ہے جبکہ یہ روایت مرسل ہے کیونکہ عثمان بن المغیرہ چھوٹے طبقہ کے تابعی ہیں اور اس سلسے میں حافظ ابن کثیر کا تائیدی قول پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس روایت کے باقی رواۃ پر مفصل جرح پیش کر کے اس روایت کا وضعی ہونا ثابت کرتے ہیں۔اس کے بعد علامہ حبیب الرحمٰن کاندھلوی

اس سلسلے میں پیش کی جانے والی سب سے مشہور روایت بعنوان ''بقیع کی کہانی'' پیش کرتے ہیں جو کہ ترمذی اور ابن ماجہ میں پائی جاتی ہے اور سیدہ عائشہؓ سے مروی ہے کہ نصف شعبان کی رات کو اللہ تعالیٰ بنو کلب کی بھیڑوں کے بالوں سے زیادہ لوگوں کی مغفرت فرماتا ہے۔ اس روایت پر نہایت دلچسپ درایتاً بحث کرنے کے ساتھ ساتھ کاندھلوی صاحب لکھتے ہیں کہ اس روایت کی بابت خود امام ترمذی نے تصریح کردی ہے کہ امام بخاری اس حدیث کو ضعیف کہتے تھے اور انہوں نے فرمایا کہ یہ روایت حجاج بن ارطات یحییٰ بن ابی کثیر سے نقل کر رہا ہے حالانکہ اس نے یحییٰ سے زندگی میں ملاقات تک نہیں کی۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یحییٰ اس روایت کو عروہ سے نقل کرتے ہیں۔ اور یحییٰ نے عروہ سے بھی کبھی ملاقات نہیں کی۔ اس طرح یہ روایت دو مقام سے منقطع ہوئی اور منقطع روایت محدثین کے نزدیک ناقابل قبول ہے اور جو روایت دو جگہ سے منقطع ہو وہ محدثین کے نزدیک معضل کہلاتی ہے اور جو انتہائی شدید قسم کی ضعیف بلکہ مردود ہوتی ہے۔ اسی لیے حافظ بدرالدین عینی حنفی، ابن دحیہ اور ابن العربی مالکی نے اسے موضوع قرار دیا۔

صفحہ ۴۳ پر کاندھلوی صاحب ابن ماجہ میں مروی سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت پر کلام کرتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی صبح کو طلوع فرماتا ہے اور کینہ پرور کے علاوہ سب کی مغفرت کردیتا ہے۔ جبکہ اس روایت کا ایک راوی عبداللہ بن لہیعہ مختلف فیہ ہے جبکہ دو راوی ضحاک بن عبدالرحمان اور عبدالرحمٰن بن عرزب مجہول ہیں سو گویا جرح و تعدیل کے میزان میں یہ روایت بھی سخت ضعیف قرار پاتی ہے۔ ساتھ وہ سیدنا ابوبکر صدیقؓ سے مروی ایک روایت پر بھی کلام کرتے ہیں جو کہ متن میں سیدنا ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت کے موافق ہے تاہم اس میں اللہ کے طلوع ہونے کا نہیں آسمان دنیا پر نزول فرمانے کا ذکر ہے۔ اس روایت کے منکر ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ ابن عدی نے اس روایت کو اپنی کتاب ''الکامل'' میں عبدالملک بن عبدالملک کی منکرات کے تحت نقل کر کے منکر قرار دیا ہے۔ ساتھ ہی کاندھلوی صاحب اسماء والرجال سے متعلق معلومات بھی بہم پہنچاتے ہیں اور یہی اس کتاب کی سب سے خوبصورت بات ہے کہ اس میں روایات پر بحث کرتے ہوئے کاندھلوی صاحب علم الحدیث سے متعلق بھی گرانقدر معلومات نہایت دلچسپ پیرائے میں ہدیۂ قارئین کرتے جاتے ہیں۔ روایات پر کلام

کے ذیل میں قارئین جابجا یہ معلومات پائیں گے۔

صفحہ ۵۰ پر زبان زد عام روایت یعنی ''رجب اللہ کا مہینہ ہے، شعبان میرا مہینہ اور رمضان میری امت کا مہینہ ہے'' پیش کر کے اس پر مفصل کلام کیا گیا ہے اور اس کا ضعف واضح کیا گیا ہے۔ پھر آگے جا کر ''شعبان کے روزے'' سے متعلق ابن ماجہ اور ابن حبان میں سیدنا علیؓ سے مروی روایت کہ ''جب نصف شعبان ہو تو رات کو قیام کرو اور دن میں روزہ رکھو'' پر کلام کیا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ اس روایت کا ایک راوی ابوبکر بن عبداللہ بن ابی سبرۃ المدنی ہے جو کہ از حد نا قابل اعتبار ہے۔ صفحہ ۶۰ سے لیکر صفحہ ۷۸ تک کاندھلوی صاحب مختلف محدثین وفقہاء کے تبصرے نقل کرتے ہیں جو کہ اس روایت کے وضعی ہونے کی بابت کلام پر مشتمل ہیں۔ اس سلسلے میں کاندھلوی صاحب ابن قیم، علامہ محمد طاہر علی الحنفی پٹنی، قاضی ابوبکر ابن العربی المالکی، ملا علی قاری، امام محمد بن الجزری، امام عینی، عبدالرحمٰن مبارکپوری اور علامہ شبیر احمد عثمانی وغیرہ کا کلام نقل فرماتے ہیں اور ساتھ ہی اس رات سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اس کی ابتداء اور روافض کے اس رات کے ایجاد کرنے سے متعلق کلام کرتے ہوئے ایک مختصر لیکن نہایت دلچسپ تاریخی خاکہ پیش کرتے ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ یہ رات بنی بویہ کے دور میں روافض نے ایجاد کی اور وہاں سے یہ اہلسنت میں در آئی۔

اسی طرح کتاب کے آخر میں ''آتش بازی یا آتش پرستی'' کے عنوان سے بحث قائم کر کے کافی دلچسپ کلام کرتے ہیں اور اس رات آتش بازی کی اصل غرض وغایت سے عوام کو روشناس کرواتے ہیں کہ یہ آل مجوس سے مستعار لیا روافض کا طریق ہے۔ پھر ''حلوے مانڈے'' کی سرخی قائم کر کے اس سلسلے میں پیش کی جانے والی مختلف روایات پر کلام فرماتے ہیں۔ المختصر کاندھلوی صاحب کی یہ کتاب نہ صرف ۱۵ شعبان سے متعلق روایات پر مفصل کلام کرتی ہے بلکہ اپنے اندر انتہائی وقیع تاریخی معلومات بھی رکھتی ہے جس کا مطالعہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ہر طالب علم کو کرنا چاہیے۔

محمد فہد حارث

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تعارف

تقریباً بیس سال قبل بعض حقیقت پسند علم دوست حضرات کے تقاضوں کے تحت جناب علامہ حبیب الرحمن صدیقی کاندھلوی نے ''فضائل شعبان المعظم'' نامی بہتر صفحوں پر مشتمل ایک کتابچہ تحریر فرمایا تھا جس میں شب براءت کے سلسلہ میں عام طور پر پیش کی جانیوالی اور نہ پیش کی جانیوالی احادیث پر روشنی ڈالتے ہوئے اور مختصر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا تھا کہ پندرہ شعبان کا روزہ اور نصف ماہ شعبان کی شب بیداری وغیرہ بدعت سیئہ اور گمراہی ہے جس کو ابن جہضم جیسے کتابوں کی سنت کی پیروی اور مسلم دیوان کا نام تو دیا جاسکتا ہے لیکن سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا سنت صحابہؓ ہرگز نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اس کتابچہ کو علماء وعوام الناس کے سامنے پیش کرنے پر پاکستان کے مفتی اعظم جناب مفتی محمد شفیع صاحب (مرحوم) نیو ٹاؤن مدرسہ کراچی کے علامہ محمد یوسف بنوری (مرحوم) اور بعض علماء اہل سنت و اہل حدیث نے اسکی تائید کی اور بعض نے خفگی کا اظہار کیا۔ بعض حضرات نے تردیدی جواب لکھنے کے عزم کا اظہار تو کیا لیکن سالہا سال کی طویل مدت گزر جانے کے باوجود ایسا کرنے سے قاصر رہے۔

بعد ازیں حق کے متلاشی متعدد حضرات نے اس بات پر زور دیا کہ شب براءت کے سلسلہ میں مکمل تحقیق ہونی چاہیے اور ایسی کتاب لکھی جانی چاہیے جو عوام کے علاوہ تحقیق کرنیوالوں کیلئے بھی حوالہ کا کام دے سکے۔ علامہ موصوف نے کاوش و چھان بین سے تقریباً ۵۷۶ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب تصنیف فرما کر اس ضرورت کو بھی پورا کر دیا ہے۔

کتاب زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ گئی ہے اور تقریباً ہر کتب فروش کے ہاں سے

دستیاب ہے۔جس کے مطالعہ سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

کتابچہ ہذا اصل کتاب کا خلاصہ اور سابقہ کتابچہ کی ایک ترمیم شدہ شکل ہے۔اس کے مطالعہ سے شب براءت کی حقیقت کو بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔جائز وصحت مند تنقید فراخ دلی کے ساتھ قبول کی جائے گی۔ الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ اسکی منتظر رہے گی اور خیر مقدم کریگی۔

معتمد عمومی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تقریظ

جناب علامہ شیخ محمد جعفر شاہ—سجادہ نشین پھلوار شریف

مذہبی تقاریب دو قسم کی ہوتی ہیں۔ایک وہ جسکی بنیاد کتاب اللہ یا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود ہے۔ مثلاً عید الفطر اور عید الضحیٰ وغیرہ اور دوسری وہ جسکی کوئی اصل، کوئی بنیاد شریعت میں موجود نہیں۔ جیسے آخری چار شنبہ کی خوشی، بارہ وفات کا سوگ وغیرہ۔جس تقریب کی کوئی ممانعت موجود نہ ہو اسکے جواز میں کوئی شبہ نہیں لیکن اس میں دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ایک یہ کہ اس میں مصالح اُمت غالب ہوں۔دوسرے یہ کہ اس پر فرائض و واجبات کی طرح پابندی و مداومت نہ ہو۔ اور اگر کسی وقت پہلوئے شر غالب آنے کا اندیشہ ہو تو اس کا ترک ضروری ہے۔ بڑی مشکل وہاں پیش آتی ہے جہاں کسی تقریب کا سراغ روایات میں ملتا ہو لیکن حقیقت میں مستند نہ ہوں۔ پھر دشواری اسوقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب صدیوں سے اُمت کا اس پر تعامل بھی رہا ہو۔

اسی قسم کی ایک تقریب شب براءت (شبرات) بھی ہے۔عوام وخواص سب میں اسقدر مقبول ہے کہ اگر اُسے کوئی نہ منائے تو اسے قابل اعتراض و ملامت تصور کیا جاتا ہے۔جن روایات پر اس تقریب کی بنیاد ہے وہ کتب احادیث میں تو موجود ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر وہ روایت صحیح بھی ہو جو کتابوں میں آگئی ہو۔ احادیث میں جہاں دو چار متواتر روایات ہیں وہاں مشہور، مرسل، منقطع، معلل، ضعیف اور موضوع روایات بھی تو ہیں۔اسی لئے محدثین کو موضوعات پر مستقل تصانیف لکھنی پڑیں۔

حبیب الرحمن صاحب محدث کاندھلوی نے اپنی اس تالیف میں ان تمام روایات کا مکمل جائزہ لیا ہے جنکا تعلق شب براءت سے ہے۔علامہ اس وقت فن رجال میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میں سمجھتا تھا کہ حضرت تمنا عمادی پھلواری کے بعد یہ فن دفن ہو گیا، لیکن علامہ حبیب الرحمن کاندھلوی کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑا

کہ یہ فن ابھی پوری آب وتاب کیساتھ زندہ ہے۔ فاضل مولف نے اپنی اس تالیف میں محض فن رجال ہی سے کام لینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عقل وفہم اور تفقہ سے کام لیکر وہ سربستہ راز طشت از بام کئے ہیں جنکی طرف بڑے بڑے اہل علم کی توجہ نہیں گئی تھی۔ انہوں نے یہ بھی بتلایا ہے کہ اس شب کا نام لیلۃ البراءۃ کیوں رکھا گیا اور کب اسکا آغاز ہوا اور راویوں کا اس سے کیا مقصد تھا اور اس سلسہ میں جو روایتیں وضع کی گئی ہیں ان کا میزان جرح وتعدیل میں کیا مقام ہے۔ لباسِ تقدس زیب تن کر کے سامنے آنے والے راویوں کی پوری خانہ تلاشی لی ہے۔ اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دیا ہے۔ یہ تو علامہ کی ایک ابتدائی کاوش ہے۔ ابھی اس سے کہیں زیادہ اہم ایک اور تالیف زیر ترتیب ہے جس میں چار پانچ ہزار ایسی روایات درج ہونگی جو خواص وعام میں مقبول ہیں لیکن وہ دراصل ضعیف، غیر معتبر یا موضوع ہیں۔ اس میں رجال کو سامنے رکھ کر اسانید کی روایت کی خانہ تلاشی کی جارہی ہے۔ اور ہر متن کو عقل کی کسوٹی پر بھی پرکھا جارہا ہے۔ خدا کرے اسکی اشاعت بھی جلد ہو جائے۔ (آمین)۔

محمد جعفر پھلواروی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نحمدُہٗ و نُصلّی علی رُسولہِ الکریم

تقریباً آج سے بیس سال پیشتر اس ناچیز نے ایک کتابچہ تحریر کیا تھا، جو فضائل شعبان اور شب برأت سے متعلقہ روایات کی تحقیق پر مبنی تھا، اور جو آج تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔ اگرچہ یہ رسالہ بھی سرسری طور پر لکھا تھا، اور خود میری نظر میں تشنہ تھا۔ اس لئے بعد میں متواتر آٹھ دس سال تک اس موضوع پر تمام روایات کی چھان بین کر کے ایک تفصیلی کتاب تحریر کی گئی، جس کا نام ''شب برأت ایک تحقیقی جائزہ'' ہے۔ (یہ کتاب بھی جو تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ہے، شائع ہو چکی ہے)۔ اس کی ضخامت کے پیش نظر بعض احباب نے اس خواہش کا اظہار کیا اتنی طویل ترین کتاب کا مطالعہ جہاں ہر شخص کے لئے دشوار ہے۔ وہاں اس کا فائدہ بھی محدود ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ایک مختصر سا کتابچہ ہو، جس سے ہر ایک استفادہ کر سکے۔ اس لئے یہ ایک مختصر سا کتابچہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ جسے مزید تحقیق مطلوب ہو وہ ہماری تفصیلی کتاب کا مطالعہ کرے۔

اس کتابچہ میں اگرچہ اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان اصل کتاب کے ضروری مضامین مختصر طور پر قارئین کی خدمت میں پیش کر دیے جائیں۔ لیکن تب بھی اسے عین خلاصہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ بہت سے مضامین اور بہت سی روایات کی تحقیق کو صرف اس لئے نظر انداز کیا گیا تھا کہ کہیں یہ کتابچہ بھی ایک طویل سفر اختیار نہیں کر لے اور کتابچہ کے بجائے ایک طویل کتاب نہ بن جائے۔

شب براءت یا شب تبرأ

سب سے اہم سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس شب کو ''شب براءت'' کس لیے کہا جاتا ہے۔ اور کیا قرآن وسنت یا فقہ وتفسیر اور تاریخ میں اس نام کی کوئی شے پائی جاتی ہے یا نہیں؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ کب اور کیسے وجود میں آئی؟ اور کیا عربی زبان میں لفظ براءت اُسی معنی میں استعمال ہوتا ہے، جس معنی میں اُردو میں استعمال کیا جاتا ہے؟

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ لفظ شب فارسی ہے، عربی میں اس کا نام ''لیلۃ البراءت'' ہونا چاہیے، یعنی براءت کی رات، اور جب تک لفظ براءت کے معنی کی تحقیق نہ ہوگی۔ اس کا صحیح مفہوم قطعاً ذہن میں نہیں آسکتا۔

''براءت'' عربی زبان میں مصدر ہے۔ اسی سے اسم فاعل ''بری'' بنا ہے۔ جس کی جمع برآء اور برئیون آتی ہے۔ اس سے لفظ مبرا بنا ہے۔ اسی لفظ براءت سے مصدر متعدی تبرا بنا ہے۔ جیسے قرابت سے تقرب، عربی زبان میں یہ تمام الفاظ بیزاری اور نفرت کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں ان کے معانی میں کوئی فرق نہیں اور یہ ہماری کوئی ذاتی اور انفرادی رائے نہیں۔

بلکہ کتاب اللہ اور حدیث رسول میں جہاں جہاں بھی یہ الفاظ استعمال میں آیا ہے۔ اس نے یہی معنی دیئے ہیں۔ اس لحاظ سے ''لیلۃ البراءت'' اور ''لیلۃ التبراء'' ہم معنیٰ ہیں تبراء کی رات۔ ہم اپنے اس دعوے کے ثبوت میں بطور نمونہ چند قرآنی اور احادیث پیش کرتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (سورہ براءت:۱)

''بیزاری کا حکم اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو جن سے تمہارا معاہدہ تھا۔''

(ترجمہ احمد رضا بریلوی)

یہ سورہ براءت کی ابتدائی آیت ہے اور اس سورت کے ساتھ بسم اللہ اسی لیے تحریر نہیں کی جاتی کہ اس میں مشرکین سے بیزاری کا اظہار ہے اور اس کی ابتداء لفظ براءت سے ہوتی ہے۔ بقول حضرت علیؓ بسم اللہ تو امان کے ہوتی ہے اور یہ سورت امان ختم کرنے اور تلوار نکالنے کے لیے نازل کی گئی ۔ (قرطبی ج ر ۴ ص ۲۰۹۱) اور بقول ابن عباسؓ یہ سورت تو رسوا کرنے والی ہے اس کی ابتدا میں بسم اللہ کیسے لکھی جاتی۔ حتیٰ کہ مفسرین نے اس سورت کا ایک نام فاضحہ بیان کیا ہے۔ یعنی رسوا کرنے والی۔ مبرد کا قول ہے کہ بسم اللہ رحمت کا سبب ہے اور سورت برأت عذاب بن کر نازل ہوئی ہے۔ اس لیے اس کی ابتدا میں بسم اللہ نہیں لکھی گئی۔

قرطبی لکھتے ہیں براءت کے معنی کسی شے کو دل سے نکال دینا اور باہمی جو تعلق ہے۔ اسے ختم کر دینا اس کا نام برأت ہے۔ اسی سے بری بنا ہے۔ (قرطبی ج ر ۴ ص ر ۲۰۹۲)

لفظ ''برأت'' کا اسم فاعل بری آتا ہے جو اُردو میں مستعمل ہے اور اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان اُس الزام سے بیزار ہے جو اس پر لگایا جا رہا ہے۔ اس معنیٰ میں بری الذمہ اور بری ہونا استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَأَذَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ﴾ (سورہ براءت: ۳)

''اور ندا پکار دینا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے سب لوگوں میں بڑے حج کے دن کہ اللہ بیزار ہے مشرکوں سے اور اس کا رسول۔''

سورۃ انعام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے کہ انہوں نے ستارے اور چاند کو دیکھ کر کہا یہ میرا رب ہے۔ پھر سورج کو دیکھنے کے بعد بھی یہی بات فرمائی، لیکن جب اسے غائب ہوتے دیکھا تو فرمایا:

﴿فَلَمَّا أَفَلَتْ قَالَ يَا قَوْمِ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ﴾ (سورہ انعام: ۷۸)

''پھر جب وہ ڈوب گیا، کہا اے قوم میں بیزار ہوں ان چیزوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو۔''(ترجمہ رضا بریلوی)

لفظ ''بری'' کی جمع بریئون اور برآء استعمال ہوتی ہے۔سورۃ یونس میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی کہلوایا گیا ہے:

﴿أَنتُم بَرِيئُونَ مِمَّا أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ﴾(سورہ یونس:۴۱)

''تم میرے عمل سے بیزار ہو اور میں تمہارے عمل سے بیزار ہوں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی یہ اعلان کردیا جاتا ہے:

﴿إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ﴾(سورہ ممتحنہ:۴)

''بے شک ہم بے زار ہیں تم سے اور ان سے جنہیں اللہ کے سوا پوجتے ہو۔''(ترجمہ احمد رضا)

قرآن میں یہ لفظ براءت اور بری جہاں استعمال ہوا ہے۔اس نے بیزاری اور نفرت کے معنی دیے ہیں۔اگر ان تمام آیات کو پیش کیا جائے تو ایک مزید کتابچہ تیار ہوجائے گا۔اس لیے ہم صرف ان چند آیات پر اکتفا کرتے ہیں۔

امام بخاری نے سورت براءت کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہؓ کا بیان نقل کیا ہے۔

قال بعثنی ابوبکر فی تلک الحجة فی الموذنین بعثهم یوم النحر یوذنون بمنی الا لا یحج بعد العام مشرک ولا یطوف بالبیت عریان قال حمید ثم اردف النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعلی بن ابی طالب فأمره ان یوذن ببراءة قال هریرة فاذن معناطی فی اهل منی یوم النحر ببراءة و ان الا لحج بعد العام مشرک ولا یطوف بالبیت عریان

(صحیح بخاری ج/۲،ص/۶۷۰)

''مجھے ابوبکر نے ان علان کرنے والوں کے ساتھ بھیجا جنہیں قربانی کے دن منیٰ میں اعلان کرنے کیلیے بھیجا گیا تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے،اور نہ بیت اللہ کا برہنہ

طواف کرے حمید راوی کا بیان ہے پھر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعد میں علیؓ بن ابی طالب کو بھیجا اور انہیں حکم دیا کہ وہ براءت کا اعلان کر دیں۔ ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ علی نے ہمارے ساتھ مل کر قربانی کے دن منیٰ میں برأت کا اعلان کیا اور اس بات کا اعلان کیا کہ کوئی مشرک اس سال کے بعد حج نہ کرے اور نہ کوئی برہنہ طواف کرے۔''

صحیح بخاری میں ابوموسیٰ اشعریؓ کا واقعہ آرہا ہے، کہ وہ مرض میں مبتلا تھے اور ان کا سر ان کی بیوی کی گود میں تھا۔ اچانک ان پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی، ان کی بیوی اس تخیل کے تحت چیخنے چلانے لگی کہ ابو موسیٰؑ کا انتقال ہوگیا۔ جب ہوش میں آئے تو فرمایا:

أنا برئ ممن برئ منه رسول الله ان رسول الله برئ من الصالقه و الحاقة و الشاقة

(بخاری ج/۱، نسائی ج/۱، ص/۱۹۰)

''میں اس سے بیزار ہوں جس سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیزار ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چیخنے والی، بال نوچنے والی کپڑے پھاڑنے والی سے بیزار ہیں۔''

صحیح مسلم میں ایک باب ہے جس کا عنوان ہے **باب موالات المومنین و براءة من المشرکین** (مومنوں سے دوستی اور مشرکوں سے بیزاری کا بیان)۔ یہ تو وہ آیات اور احادیث تھیں جن میں لفظ ''براءت'' اور ''بری'' استعمال کیا گیا تھا۔ اب وہ آیات ملاحظہ کیجیے جن میں لفظ ''تبرا'' استعمال کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ﴾ (سورہ براءت: ۱۱۴)

''جب ابراہیم پر یہ ظاہر ہوگیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہوگئے۔''

نیز ارشاد ہے:

﴿إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ۔ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا﴾ (سورہ بقرۃ:

۱۶۶،۱۶۷)

''جب بیزار ہوں گے پیشوا اپنے پیروں سے اور دیکھیں گے عذاب اور کٹ جائیں گی ان سب کی ڈوریں اور کہیں گے پیرو کاش ہمیں لوٹ کر جانا ہوتا تو ہم ان بیزار ہو جاتے جیسے یہ ہم سے بیزار ہوئے۔'' (ترجمہ احمد رضا)

ان تمام آیات اور احادیث سے یہ بات یقینی طور پر ثابت ہوگئی کہ براءت اور تبرا ہم معنیٰ ہیں۔

یعنی یہ دونوں لفظ بیزاری کے معنی دیتے ہیں اور ''شب براءت'' کے معنیٰ ہیں ''شب تبرا'' یعنی شب بیزاری اور یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ اس شب میں رافضی اپنے فرضی امام کی پیدائش کی خوشی مناتے اور صحابہ کرام اور تمام مسلمانوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ بلکہ شیعوں کی کتاب میں یہاں تک تحریر ہے کہ ان کے امام مہدی ظاہر ہو کر روئے زمین پر مومنین کی حکومت قائم کریں گے، اور ابوبکر و عمر کی قبروں سے لاشیں نکال کر انہیں پھانسی دیں گے اور تمام بے دینوں یعنی مسلمانوں کو قتل کریں گے یہ الفاظ خود واضح تبرا ہیں اور یہ رات دراصل شب تبرأ ہے۔ اور سنیوں کو بے وقوف بنانے کے لیے اولاً تو شب تبرا کے بجائے اس رات کا نام شب براءت رکھا گیا۔ ثانیاً اس رات کی عبادت اور قبرستان جانے کے قصے اس لیے وضع کیے گئے تاکہ سنیوں کو اصل حقیقت کا علم نہ ہو سکے۔ اسی لیے اکثر روایات میں مغفرت کا تو ذکر ہے۔ لیکن کسی عبادت کا کوئی ذکر نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی عبادت کچھ اور ہے۔ اور سینوں کی عبادت کچھ اور۔ اس لیے ان روایات میں کسی عبادت کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔

چونکہ شیعہ اس رات غاروں، دریاؤں اور کنوؤں پر جا کر اپنے امام کے نام پر چیاں ڈالتے اور ان سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم ان سنیوں کے ہاتھوں تنگ آ چکے ہیں۔ للہ اب تو آپ تشریف لائیے اور ان ملحدین سے ہمیں نجات دلائیے۔ اسی لیے خمینی اہل عراق اور تمام مسلمانوں کو ملحدین کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اسی لیے پاکستان اور سعودی عرب کے خلاف زہر اگلا جاتا ہے۔ بلکہ حال ہی میں ایک کتاب فارسی میں ایران سے شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے ''خمینی فی القرآن'' جس میں مصنف نے اس کی صراحت کی ہے

کہ قرآن میں جہاں جہاں یاایھا الرسول اور یاایھا النبی کے الفاظ آئے ہیں اس سے مراد خمینی کی ذات ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ انہیں اسلام سے کتنی عداوت ہے؟

الغرض اس شب میں وہ اپنے امام کی پیدائش کی خوشی میں حلوے پکاتے ہیں اور انہیں اس بات کا خطرہ ہوتا ہے کہ اگر سنیوں کو شب براءت کی حقیقت بتادی گئی تو کہیں اس فرضی امام کو سنی ختم نہیں کر دیں، یا آج کل کے سنی اسے اپنا مہدی نہ بنالیں۔لیکن امام صاحب اپنے مؤمنین سے اتنے خوفزدہ ہیں کہ وہ ان کی صورت دیکھتے ہی ڈر جاتے ہیں کہ چندسال کی عمر میں میری پشت پر قرآن علی،قرآن فاطمہ اور تمام آئمہ کے فرضی صحیفے لادے گئے تھے۔اب اگر میں باہر نکل آیا تو پندرہ سوسال کی کتابیں لادنی پڑیں گی اِسی لیے انہوں نے خمینی کی صورت میں پہلے اپنے ایک نائب کو بھیجا ہے تاکہ پیش آئندہ حالات کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ پانچویں صدی ہجری کی ابتداء تک حدیث وتفسیر کی جتنی بھی کتابیں تصنیف کی گئیں اوراس سلسلے کی جتنی روایات ان کتابوں میں نقل کی گئیں۔ان میں سے کسی روایت میں لیلۃ البراءت کا لفظ قطعاً نہیں پایا جاتا۔ بلکہ ہر روایت میں آپ کو یہ الفاظ ملیں گے۔ **اذا کانت لیلۃ النصف من شعبان** یعنی جب نصف شعبان کی رات ہو۔جواس بات کا بین ثبوت ہے کہ اس کا یہ نام پانچویں صدی کے آخر میں وضع ہوا۔اس کے واضع صوفیاء ہیں۔اس رات کا نام ابن جہضم کی بھجۃ الاسرار،غزالی کی احیاء العلوم اور عبد القادر جیلانی کی غنیۃ الطالبین میں ملتا ہے اور یہ سب پانچویں صدی کے افراد ہیں اور سب صوفی ہیں اتفاق سے ان لوگوں نے جو بھی روایات نقل کی ہیں،ان روایات میں بھی اس کا کوئی نام مذکور نہیں۔

ممکن ہے کہ اولاً یہ نام اس لیے مخفی رکھا گیا ہو کہ پہلے پروپیگنڈے کے ذریعے سنیوں کے ذہن میں اس رات کی فضیلت بٹھادی جائے۔تاکہ جب نام ظاہر کیا جائے تو سنی حضرات بدک نہ جائیں۔یہ بھی ممکن ہے کہ نام بنو بویہ اور دیلمیوں کے زمانہ میں وضع کیا گیا ہو،کیونکہ وہ کٹر رافضی تھے اور ۳۲۲ھ سے ۳۶۸ھ تک بغداد پر قابض رہے۔ان ہی میں سے ایک شخص معزالدولہ نے ۳۳۶ھ میں عشرۂ محرم میں ماتم کی ابتدا کی۔موجودہ جمعے کے خطبات جو ہماری مساجد میں پڑھے جاتے ہیں یہ ان ہی کے وضع کردہ ہیں۔اس نے

خطبات میں عشرہ مبشرہ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تین صاحبزادیوں کے نام خارج کیے۔ ازواج مطہرات کا ذکر حذف کر کے حسن رضی اللہ تعالی عنہ وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ذکر داخل کیا گیا۔ اسی زمانے میں اس بات کا فیصلہ کیا گیا کہ خلفائے راشدین چار ہیں۔ ورنہ اس سے قبل تمام سنی تین خلفائے راشدین کے قائل تھے۔

معزالدولہ نے مساجد کے دروازں پر لکھوایا تھا۔ **لعن اللہ علی ابی بکر و عمر و عثمان و معاویة و عمر بن العاص** وغیرہ ذلک جسے سنیوں نے مٹا دیا۔ یہ جھگڑا کافی عرصہ چلتا رہا اور اس بات پر فیصلہ ہوا کہ مسجدوں میں خلفائے اربعہ کے نام لکھے جائیں۔ اس پر سنیوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن جب ۳۶۸ھ میں بنو بویہ کی حکومت ختم ہوگئی۔ تو سنیوں نے چاروں خلفاء کے نام کے ساتھ امیر معاویہ کا نام بھی لکھ دیا۔ اس طرح خلفائے راشدین کی تعداد پانچ ہوگئی۔

ایسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ بنو بویہ رافضیوں نے شب براءت کا سلسلہ جاری کیا ہو اور اس کے فضائل لوگوں میں پھیلائے ہوں۔ جہاں سے صوفیاء اسے لے اڑے۔ کیونکہ صوفیاء میں کوئی فرد واحد ایسا نہیں گزرا جس نے حدیث میں تحقیق سے کام لیا ہو۔ حتیٰ کہ غزالی جو امامت کے رتبہ پر آج کل فائز سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ حدیث کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ یہ بھی صرف بطور تبرک۔

لیلۃ مُبارکہ کی تفسیر

ہمارے ہندو پاک اور عجمی علماء نے مزید کارنامہ انجام دیا کہ کلام اللہ کی ایک محتمل المعنی آیت کا سہارا لے کر اور پھر اسکی غلط تاویل پیش کر کے پوری عمارت تعمیر کر دی۔ یہ حضرات بطور دلیل حسب ذیل آیت پیش کرتے ہیں:

﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ۔ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ۔ أَمْرًا مِّنْ عِندِنَا ۚ إِنَّا كُنَّا مُرْسِلِينَ۔ رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ (سورہ دخان:

۲۔۳۔۴۔۵)

''بیشک ہم نے اسے برکت والی رات میں اُتارا ہے۔ بیشک ہم ڈرانے والے ہیں، اس میں بانٹ دیا جاتا ہے ہر حکمت والا کام، ہمارے پاس کے حکم سے بیشک ہم بھیجنے والے ہیں، تمھارے رب کی طرف سے رحمت بیشک وہی سنتا جانتا ہے۔'' (ترجمہ احمد رضا)

یہ آیات سورۃ دخان کی ابتدائی آیات ہیں، جو مکہ معظّمہ میں معراج سے قبل نازل ہوئی۔ اس وقت تک نماز پنجگانہ بھی فرض نہیں ہوئی تھی اور روزے تو ۲ھ میں فرض ہوئے اور نماز معراج کے وقت فرض ہوئی اور نہ مکہ میں بقیع نام کا کوئی قبرستان تھا۔ اس طرح قبرستان کے چکر لگانے یا اس رات عبادت کرنے یا اس دن روزہ رکھنے سے اس آیت کا کیا تعلق ہے؟ ان آیات کریمہ میں چار امور ذکر کئے گئے ہیں۔

① اس مبارک رات میں قرآن مجید نازل کیا گیا۔

② اس شب میں تمام احکامات کے فیصلے کئے جاتے ہیں۔

③ اس شب میں نزول رحمت ہوتا ہے۔

④ یہ رات مبارک رات ہے۔

یہ رات کون سی ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟ یہ سال میں کب آتی ہے؟ اور یہ کس مہینے کی رات ہے؟ ان تمام امور سے یہ آیات خاموش ہیں۔ ان آیات میں صرف اتنی بات ظاہر کی گئی ہے کہ یہ رات مبارک ہے جو کسی رات کی تعریف وتوصیف تو ہوسکتی ہے لیکن یہ کسی رات کا نام نہیں ہوسکتا۔ اور اگر بالفرض المحال یہ کسی رات کا نام بھی ہے، تب بھی اس آیت میں اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ یہ کونسی رات کا نام ہے۔ اسی طرح یہ آیت اپنے مفہوم کی قطعاً وضاحت نہیں کرتی۔ یہ بھی ایک مسلمہ اصول ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ ہے، کیونکہ جو شے ایک مقام پر مجملاً ذکر کی جاتی ہے، قرآن دوسرے مقام پر اس کی تشریح ضرور کرتا ہے، اس لحاظ سے یہ لازم ہے کہ اس کی وضاحت بھی قرآن میں دوسرے مقام پر کی گئی ہو۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ۔ وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ۔ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ۔

تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِم مِّن كُلِّ أَمْرٍ۔ سَلَامٌ هِيَ حَتَّىٰ مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾ (سورۃ القدر)

''بیشک ہم نے اسے شب قدر میں اتارا اور تم نے کیا جانا کہ شب قدر کیا ہے شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر، اس میں فرشتے اور جبریل اترتے ہیں اپنے رب کے حکم سے ہر کام کے لیے وہ سلامتی ہے صبح چمکنے تک۔'' (ترجمہ احمد رضا)

ان آیات میں جو دعوے کیے گئے ہیں بعینہ وہی دعوے ہیں جو سورہ دخان کی آیات میں کیے گئے تھے۔یعنی:

① اس رات میں قرآن نازل کیا گیا۔

② اس رات میں تمام امور کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔

③ اس رات میں صبح صادق تک رحمت وسلامتی کا نزول ہوتا ہے۔

فرق صرف اتنا ہے کہ سورۂ دخان کی آیات میں اس رات کو لیلۃ مبارکہ سے تعبیر کیا گیا، اور سورۃ القدر میں لیلۃ القدر سے کیونکہ اس شب میں تمام امور کے فیصلے کئے جاتے ہیں۔اس لحاظ سے اس رات کا نام لیلۃ القدر اور اس لحاظ سے کہ اس میں رحمت نازل ہوتی ہے۔اس رات کا نام لیلۃ مبارک ہے بیان کیا گیا۔

ہجرت مدینہ تک قطعا اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی تھی کہ نزول قرآن کی یہ رات کون سے مہینے میں واقع ہوتی ہے۔اُس وقت تک تو یہ اشکال پیدا ہوسکتا تھا کہ وہ ماہ شعبان یا کسی اور ماہ کی کوئی رات ہو۔لیکن جب ۲ھ میں روزوں کی فرضیت کے ساتھ ساتھ یہ آیت نازل کردی گئی:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾ (سورہ بقرۃ:۱۸۵)

''رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اترا (ترجمہ) اتارا گیا۔''

پھر آگے فرمایا گیا:

﴿فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾(سورہ البقرۃ:۱۸۵)

''توتم میں جوکوئی یہ مہینہ پائے ضرور اسکے روزے رکھے۔''

ان آیات نے یہ بات واضح کردی کہ وہ رات رمضان میں واقع ہوتی ہے۔ بلکہ رمضان میں جو روزے فرض کئے گئے اور رمضان کو جو بھی فضیلت حاصل ہے وہ اس شب نزول قرآن کے باعث ہے۔ اب خواہ اسے لیلۃ القدر کہیے، یا لیلۃ مبارکہ یا لیلۃ الرحمہ، یہ ایک رات ہی ہے، اور اس کا رمضان میں ہونا لازم ہے۔اسی رات کے باعث رمضان میں قیام رمضان اور آخر عشرہ میں اس کی تلاش میں قیام لیلۃ القدر کا حکم دیا گیا اور ارشاد فرمایا گیا:

من قام رمضان ایمانا و احتسابا غفر لہ ماتقدم من ذنبہ (نسائی ج/۱ص/ ۲۲۲)

''جو رمضان میں ایمان رکھتے ہوئے اور ثواب کی امید میں قیام کرے تو اسکے گزشتہ گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔''

نیز ارشاد فرمایا گیا:

من قام لیلۃ القدر ایمانا و احتسابا غفر لہ ماتقدم من ذنبہ (نسائی ج/۱ص/ ۲۲۲)

''جس نے لیلۃ القدر میں ایمان رکھتے ہوئے اور ثواب کی غرض سے قیام کیا تو اسکے گزشتہ گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔''

اگر لیلۃ القدر سے مراد شب براءت تھی اور تقدیر اسی رات میں لکھی جاتی تھی، تو پھر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرمانا چاہیے تھا:

من قام شعبان ایمانا و احتسابا غفر لہ ما تقدم من ذنبہ ''جس نے ایمان رکھتے ہوئے اور ثواب کی غرض سے شعبان کا قیام کیا تو اسکے گزشتہ گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔''

اور

من قام لیلة البراءة ایمانا و احتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه ''جس شخص نے لیلۃ براءت میں ایمان لاتے ہوئے اور ثواب کی نیت سے قیام کیا تو اسکے گزشتہ گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔''

لیکن ایسا نہیں فرمایا گیا۔ بلکہ کسی روایت میں ''لیلۃ البراءت'' کا لفظ تک نہیں استعمال کیا گیا۔ جس کی تفصیل لفظ براءت میں گزر چکی۔ یاد رکھیے کہ رمضان سے باہر کسی مبارک رات کا کوئی وجود نہیں۔ اس کی مزید تائید سورۃ انفال کی ایک اور آیت سے بھی ہوتی ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَمَا أَنزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ﴾ (سورہ انفال:۴۱)

''اور اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن اتارا جس دن دونوں فوجیں ملی تھیں۔''

(ترجمہ احمد رضا)

یعنی اس قرآن کا نزول یوم فرقان میں ہوا۔ اور یوم فرقان وہ روز ہے، جس دن دو جماعتیں باہم ٹکرائی تھیں اور اس پر تمام اُمت متفق ہے کہ یوم فرقان سے مراد روز بدر ہے اور دو جماعتوں سے مراد صحابہ کرام اور مشرکین مکہ ہیں اور اس پر پوری اُمت کا اتفاق ہے کہ جنگ بدر سترہ رمضان کو واقع ہوئی۔

ان تمام آیات کو جمع کرنے کے بعد جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید رمضان کی کسی شب میں نازل کیا گیا اور اسی شب کا نام لیلۃ القدر اور لیلۃ مبارکہ ہے۔ اب اگر جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ قرآن شب برأت میں نازل ہوا اور لیلۃ مبارکہ سے شب براءت مراد ہے جہاں وہ قرآن کی تکذیب کررہا ہے۔ وہاں دبے الفاظ میں وہ یہ بھی دعویٰ کررہا ہے کہ جنگ بدر شعبان میں واقع ہوئی اور اللہ تعالیٰ کو چاہیے تھا کہ رمضان المبارک کے بجائے شعبان کے روزے فرض کرتا۔ اس میں قیام اور اعتکاف کا حکم دیا جاتا۔ گویا عیاذاً باللہ۔ اللہ تعالیٰ نے ایک صریح غلطی کا ارتکاب کیا۔

اس حماقت کا زبردستی یہ حل تلاش کیا گیا کہ قرآن مجید دو بار نازل ہوا ہے۔ کیونکہ عجمی علماء کا ذہن یہ بات قبول کرنے کو تیار نہیں کہ صوفیاء جس رات کی فضلیت کے گن گاتے رہے ہوں، اس کا اس فضیلت سے

دور کا بھی کوئی تعلق نہ ہو اور ہماری شخصیت پرستی اور پیر پرستی ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم صوفیاء کی غلطی کو تسلیم کرلیں۔ اس لیے یہ تو ممکن نہیں کہ صوفیاء سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہو۔ بہتر یہ ہے کہ قرآن کی تاویل کر لی جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے غلطی ممکن ہے اور شیعوں کے یہاں اسکا وجود بھی ہے۔ جسے مسئلہ بدا کہتے ہیں۔ یہ سب شخصیت پرستی اور اندھی تقلید کے نتیجے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے پیروں اور بزرگوں کی مدافعت میں موضوع اور منکر روایات کا سہارا لیتے ہیں۔ حالانکہ ہندو پاک کے ایک مشہور صوفی یعنی شیخ احمد سرہندی اپنے مکتوبات میں فرماتے ہیں۔

''عمل صوفیاء ز وحلت وحرمت حجت نیست'' حلت وحرمت میں صوفیاء کا عمل حجت نہیں ہے۔

''ہماں لحد است کہ ما آیھا را معذور داریم۔'' یہی کافی ہے کہ ہم انہیں معذور تصور کرلیں۔

دوسرے مقام پر ایک شریعی مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دریں جا قول ابی بکر شبلی وجنید بغدادی و بایزید بسطامی ھیچ اعتبارے ندا جا قول رابی حنیفہ و مالک وشافعی وابی یوسف ومحمد بن الحن اعتبارے دارد''

''ان مسائل فقیہ میں جنید بغدادی بایزید بسطامی اور ابوبکر شبلی کا قول کچھ اعتبار نہیں رکھتا۔ اس جگہ ابوحنیفہ، مالک، شافعی، ابو یوسف اور محمد بن الحسن کا قول اعتبار رکھتا ہے۔''

جس طرح فقہی مسائل میں ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد بن حنبل وغیرہ کے اقوال کا اعتبار کیا جائے گا۔ اسی طرح حدیث میں یحیی بن معین، ابوزرعہ اور ابوحاتم کے اقوال کو دیکھا جائے گا۔ نہ کہ ان صوفیاء کے اقوال کو جنہیں صحیح وسقیم کی بھی تمیز نہیں۔

اصول تفسیر اور اصول فقہ کا یہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ جب کسی آیت کے معنی محتمل اور مشتبہ ہوں تو اس کے معنی کی تعیین محکم ومفسر آیت سے کی جائے گی اور وہی معنی مراد لیے جائیں گے، جن کی تائید محکم ومفسر آیات کررہی ہیں، محکم ومفسر کی موجودگی میں مشتبہ کو اختیار کرنا سراسر گمراہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾

(سورہ آل عمران: ۷)

''وہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اشتباہ والی کے پیچھے پڑتے ہیں۔ گمراہی اور فتنہ چاہنے اور اس کا پہلو ڈھونڈنے کو'' (ترجمہ احمد رضا)

ان پیر پرست علماء نے محکم ومفسر کو چھوڑ کر مشتبہ پر اپنی بنیاد قائم کی۔ تاکہ صوفیا کی غلطی کا کسی نہ کسی طرح ازالہ کیا جائے اور بطور دلیل عکرمہ مولی ابن عباس کا قول پیش کیا۔ کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد شب برأت ہے۔ حالانکہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، امام سعید بن المسیبؒ، امام مجاہد، حسن بصری، ضحاک، زید بن اسلم، قتادہ ابوالعالیہ اور ابو مالک کا قول یہ ہے کہ لیلۃ مبارکہ سے لیلۃ القدر مراد ہے اور بعد کے علماء میں ابن عربی، ابن قیم، ابن دحیہ، ابن تیمیہ، ابن حجر، ابن کثیر، قرطبی، فوددی، جلال الدّین سیوطی، ابوبکر جصاص رازی، بدرالدین عینی حنفی، امام ملحادی حنفی، عبدالحق حقانی، ملاعلی قاری، فخرالدین رازی اور بغوی وغیرہ، تمام علماء مفسرین ومحدثین اس پر متفق ہیں کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہے۔ لیکن ان تمام علماء کی تقلید چھوڑ کی عکرمہ کی تقلید صرف اس لیے کی گئی کہ اس سے صوفیا کے قول کی تائید ہوتی تھی۔ حالانکہ یہ عکرمہ خارجی تھا، اور تمام مسلمانوں کا قتل فرض سمجھتا تھا، امام سعید بن المسیب، ابن حون، محمد بن سیرین، حماد بن زید اور امام مالک اسے کذاب کہتے ہیں۔ عبداللہ بن عباس کے صاحبزادے علی بن عبداللہ بن عباس نے اسے بیڑیوں میں باندھ کر ڈالدیا تھا۔ جب ان سے اس کی وجہ دریافت کی گئی۔ تو انہوں نے فرمایا۔

''ھذا الخبیث یکذب علی ابی'' ''یہ خبیث میرے باپ پر جھوٹ بولتا ہے۔''

اسی باعث امام مالک اور امام مسلم نے اس سے کوئی روایت نہیں لی اور عکرمہ کے اس قول کو تمام محدثین نے منکر قرار دیا اور بعد کے تمام محدثین ومفسرین اس قول کو رد کرتے رہے۔ عکرمہ کا اصل قول کیا ہے۔ وہ ہم امام قرطبی کے الفاظ میں آگے پیش کریں گے۔

شب براءت اور اس امر کے ثبوت کے لیے کہ لیلۃ مبارکہ سے شب براءت مراد ہے جہاں کچھ جھوٹی اور من گھڑت روایات کا سہارا لیا گیا۔ وہاں بعض صحابہؓ، تابعین اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب صریح جھوٹ بھی

منسوب کیا گیا۔جس کی بین مثال عبداللہ بن عباس کا قول ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ارشادات کی حقیقت

عکرمہ نے عبداللہ بن عباس کی جانب یہ قول منسوب کیا کہ وہ لیلۃ مبارکہ سے شب تبرّ امراد لیتے تھےاورسورہ دخان کی آیات کی تفسیر میں یہ الفاظ ان کی جانب منسوب کئے گئے:

عن عکرمہ عن ابن عباس فیھا یفرق امر حکیم قال لیلۃم نصف شعبان یبین فیھا اسما الموتی وینسخ فیھا الحاج فلا یزاد فیھم ولا نیقص (میزان الاعتدال ج رص/ ۶۵۵۴)

''عکرمہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کی اس آیت فیھا یفرق امر حکیم سے تو نصف شعبان کی شب ہے۔جس میں اللہ تعالیٰ مردوں کے نام ظاہر فرماتا ہے اوراس رات میں حاجیوں کے نام مٹائے جاتے ہیں۔پھران میں نہ زیادتی کی جاتی ہے نہ کمی۔'' (اس عبارت کا اصل ترجمہ یہی ہے)

حالانکہ عربی زبان کے لحاظ سے اسکی عربی درست نہیں ہے۔دراصل یہ ابن عباس کا قول نہیں ہے بلکہ عکرمہ کا اپنا قول ہے۔اورعبداللہ بن عباس کے صاحبزادے کے بقول یہ عکرمہ خبیث میرے باپ پر جھوٹ بولتا ہےاوربقول سعید بن المسیب کہ انہوں نے مرتے وقت اپنا غلام وبرہ سے فرمایا:

یا وبرۃ لا تکن ب علی کما کذب عکرمۃ علی ابن عباس

''اے وبرہ مجھ پراس طرح جھوٹ نہ بولنا جس طرح عکرمہ ابن عباس پر جھوٹ بولتا ہے۔''

اس قسم کی وصیت اسی وقت ممکن ہے جب عکرمہ اپنے جھوٹ میں شہرت حاصل کر چکا ہو۔بغیر شہرت اس قسم کی وصیت ممکن ہی نہیں۔یہ بھی ذہن میں رہے کہ امام سعید بن المسیب ایک صحابی کے صاحبزادے اورایک صحابی کے پوتے تھے۔یہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں پیدا ہوئے۔اورسینکڑوں صحابہ سے استفادہ علم

کیا اور ۹۱ھ میں انتقال ہوا۔ محدثین انہیں سید التابعین کہتے ہیں۔ اور جب یہ وصیت کی جارہی تھی تو عکرمہ زندہ تھا۔ کیونکہ اس کی موت ۱۰۷ھ میں واقع ہوئی۔ گویا ۹۰ھ سے قبل ہی عکرمہ اپنے جھوٹ میں مشہور زمانہ ہو چکا تھا۔ کیونکہ اسے جھوٹا قرار دینے والوں میں سعید بن المسیب اور امام مالک مدینہ کے باشندہ ہیں اور محمد بن سیرین بصرہ کے باشندہ اور حماد بن زید کوفہ کے باشندہ ہیں۔ حتیٰ کہ امام حماد بن زید نے وفات کے وقت یہاں تک فرمایا کہ یہ عکرمہ کہا کرتا تھا کہ قرآن تو نازل لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ عیاذا باللہ امام ذہبی ان الفاظ کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں یہ الفاظ کتنی خباثت اور گمراہی سے معمور ہیں۔

ایسی صورت میں یہ کیسے تسلیم کرلیا جائے کہ عکرمہ نے ابن عباس کی جانب جو بات منسوب کی ہے وہ درست ہے۔ اسی لیے امام ذہبی نے میزان میں اور ابن عدی نے کامل میں اس قول کو منکر قرار دیا ہے۔ (میزان ج/ ۲، ص/ ۲۵۵)

اتفاق سے بعض محدثین نے عکرمہ کو ثقہ قرار دیا ہے۔ جس کی وجہ محدثین کا ایک خاص اصول ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ خارجی طبقہ جھوٹ کو کفر کہتا ہے۔ لہذا اس کا جھوٹ بولنا ممکن نہیں۔ اسی لیے متعدد محدثین نے اس سے روایات لی ہیں۔ لیکن امام حماد بن زید المتوفی ۱۷۹ھ فرماتے ہیں ہم بھی پہلے یہی تصور کرتے تھے کہ خارجی جھوٹ نہیں بولتے، لیکن تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ اس طبقہ کے افراد بھی جھوٹ کے مرض میں مبتلا ہیں۔۔۔۔۔ بلکہ عکرمہ ان کا سرخیل ہے اس لیے کہ مجھے ۱۰۷ھ سے قبل کوئی ایسا خارجی نظر نہیں آتا جس کی جانب جھوٹ کی نسبت کی گئی ہو۔

بہر صورت یہ اتنا بدنام زمانہ تھا کہ جس روز اس کا انتقال ہوا اسی روز امام کُثیر عزہ کا بھی انتقال ہوا۔ شہر کے تمام باشندے کثیر کے جنازے میں شریک ہوئے، لیکن عکرمہ کے جنازے پر کوئی نہ پھٹکا۔ صرف چند سوڈانی غلاموں نے اسے دفنایا۔ امام ذہبی نے یہ تمام حالات میزان الاعتدال میں تحریر فرمائے ہیں۔

شب براءت کا اصل بانی مبانی یہی ہے۔ کیونکہ اس نے لیلۃ المبارکۃ سے لیلۃ البراءت مراد لی تھی اور بعد میں اس کے اس قول کو پیش نظر رکھ کر شیعہ اور صوفیاء نے اس پر ایک عمارت تعمیر کردی۔ چونکہ بعض

محدثین نے اسے ثقہ قرار دیا تھا اسی باعث ابن عدی اور ذہبی نے ابن عباس کی جانب اس جھوٹ کا واضع عکرمہ کے بجائے عکرمہ کے شاگرد اسمٰعیل بن نفر کو قرار دیا۔ کیونکہ اسمٰعیل بن نفر کے علاوہ یہ قول اور کوئی روایت نہیں کرتا۔ خواہ اس کا واضع عکرمہ ہو یا اسمٰعیل بن نفر مقصود سب کا یہ ہے کہ یہ ابن عباس کا قول قطعاً نہیں۔

یہ اسمٰعیل بن نفر کون ہے۔ ابن عدی اور ذہبی اس کا خاکہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ ذہبی کے الفاظ ہیں:

''یہ اسمٰعیل بن نفر کوفہ کا باشندہ ہے، قبیلہ بجیلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی کنیت ابوالمغیرہ ہے۔ ۱۸۲ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ محدثین کے نزدیک یہ قابل قبول نہیں یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں یہ کچھ نہیں۔ نسائی اور ابوذرعہ کہتے ہیں قوی نہیں۔ ابن حبان کہتے ہیں اس کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے اس کی روایت ترک کر دی گئی۔'' (میزان ج/۴، ص/۲۵۵)

نسائی کتاب الضعفاء میں فرماتے ہیں ''یہ قوی نہیں'' کتاب الضعفاء کے حاشیہ میں امام احمد حنبل کا قول نقل کیا گیا ہے کہ یہ اسمٰعیل بن نفر تو سند بھی یاد نہ رکھ سکتا تھا۔ حتیٰ کہ ابوبکر بن ابی شیبہ فرماتے ہیں اس نے جتنے اقوال اور روایات اسمٰعیل بن قیس کی جانب منسوب کی ہیں۔ وہ سب زید بن اسلم کی روایات ہیں (کتاب الضعفاء نسائی ص/۱۰۲)

یعنی اس اسمٰعیل بن نفر کا حافظہ اتنا خراب تھا کہ کسی کی روایت کو یاد نہ رکھ سکتا تھا۔ زید بن اسلم کے اقوال اسمٰعیل بن قیس کی جانب منسوب کر دیے۔ اسی طرح اس مقام پر عکرمہ کا قول ابن عباس کی جانب منسوب کر دیا۔ اب خواہ یہ جرم اسمٰعیل بن نفر نے کیا ہو یا خود عکرمہ اس جرم کا مرتکب ہوا ہو، بہرصورت اس سے کسی صورت انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ جرم سرزد ہوا ہے۔ اسی لیے کسی محدث اور مفسر نے ابن عباس کی جانب اس قول کی نسبت نہیں کی۔ بلکہ تمام مفسرین نے ابن عباس کا جو قول نقل کیا ہے۔ وہ پیش خدمت ہے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں:

قوله تعالی فیها یفرق کل امر حکیم قال ابن عباس یحکم الله امر الدنیا الی قابل فی لیلة القدر ما کان من حیات او موت او رزق (تفسیر قرطبی، ج/۷،ص/۵۹۴۶)

''**فیها یفرق کل امر حکیم** کی تفسیر میں ابن عباس فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ لیلۃ القدر میں آئندہ سال تک تمام دنیاوی امور کا حکم دیتا ہے۔خواہ زندگی ہو یا موت یا رزق۔''

یعنی ابن عباسؓ کے نزدیک لیلۃ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہے اور اسی میں تمام امور کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔لیکن عکرمہ خارجی وہ واحد ہستی ہے جو اس امر کی مدعی ہے کہ یہ لیلۃ مبارکہ نصف شعبان کی شب ہے:

هی لیلة النصف من شعبان فیها امر السنة و ینسخ الا حیاء من الاموات و یکتب الحاج فلا یزاد فیهم احد و لا ینقص منهم احد (قرطبی ج/۷،ص/۵۹۴۹)

''اس میں سال بھر کے احکامات دیئے جاتے ہیں اور زندوں کے نام مردوں کی فہرست سے مٹائے جاتے اور حاجیوں کے نام لکھے جاتے ہیں۔پھر ان میں نہ اضافہ کیا جاتا ہے اور نہ کمی۔''

ابن عباسؓ کی جانب جو قول منسوب کیا گیا تھا وہ دراصل عکرمہ خارجی کا قول تھا اور چونکہ بقول امام حماد بن زید اس عکرمہ کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ قرآن تو گمراہی کے لیے نازل کیا گیا ہے۔اس لیے اس نے لیلۃ مبارکہ کی تفسیر لیلۃ البراءت سے کر کے اُمت میں ایک نئی گمراہی کا دروازہ کھول دیا۔یہ وہ مفسر اعظم جس کے قول کو صوفیاء اور ہندو پاک کے پیر پرست علماء سینے سے لگائے بیٹھے ہیں اور ہر سال شب برأت کے موقع پر سورہ دخان کی آیات تلاوت کر کے اور عکرمہ خارجی کا قول دلیل میں پیش کر کے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ ہماری ان سے عرض یہ ہے کہ عکرمہ کے دیگر اقوال میں بھی اس کی تائید کیجیے پھر دیکھیے کیسا تماشہ نظر آتا ہے۔ اگر اس کے اقوال آپ کے علم میں نہیں ہوں تو ہم اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے تیار ہیں۔عکرمہ کے اس

قول کو پیش نظر رکھ کر بعد کے کذابین نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب بھی جھوٹی باتیں منسوب کر دیں۔ جن میں سے ایک روایت عثمان بن المغیرہ کی ہے۔

عثمان بن المغیرہ کی روایت

قال رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تقطع الاجال من شعبان الی شعبان حتی ان الرجل ینکح و یولدله و اخرج اسمه فی الموتی (قرطبی ج ۴، ص ۵۹۴۷ اور تفسیر ابن کثیر ج ۴، ص ۱۳۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''شعبان سے شعبان تک موتوں کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ حتی کہ ایک شخص نکاح کرتا ہے یا اسکی اولاد ہوتی ہے حالانکہ اس کا نام مردوں کی فہرست میں داخل کیا جاتا ہے۔''

عثمان بن المغیرہ کی اس روایت کو اگر فرشتے بھی نقل کرتے تب بھی یہ قابل اعتبار نہ ہوتی۔ کیونکہ عثمان بن المغیرہ کوئی صحابی نہیں بلکہ چھوٹے درجہ کا تابعی ہے اور یہ روایت مرسل ہے۔ اور پھر قرآن کے سراسر خلاف ہے۔ اسی لیے حافظ ابن کثیر نے اس روایت کو نقل کرنے کے بعد یہ فیصلہ بھی دیا۔

هذا حدیث مرسل و مثله لا یعارض به النصوص (تفسیر ابن کثیر ج ۴، ص ۱۳۸)

''یہ حدیث مرسل ہے اور اس قسم کی روایات قرآن کے مقابل پر پیش نہیں کی جاسکتیں۔''

یعنی جہاں یہ روایت مرسل ہے وہاں قرآن کی آیات کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ امام ابن کثیر نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ لیلۃ مبارکہ سے جو شخص شب براءت مراد لیتا ہے اس نے قرآن کی صریح مخالفت کی اور انتہائی خلاف عقل بات کی۔ لیلۃ مبارکہ سے مراد لیلۃ القدر ہے۔ اس لیے یہ روایت مردود ہے۔ یہ ابن کثیر کا فیصلہ ہے۔

ہمارے نزدیک محدثانہ نقطہ نگاہ سے اس روایت میں ایک اور زبردست عیب پایا جاتا ہے۔ اولاً اس کی سند سن لیجیے۔ اسے مغیرہ بن اخنس سے امام زہری اور امام زہری سے امام لیث بن سعد الصری نقل کر رہے

ہیں۔زہری اورلیث علم حدیث میں ایک ستون کا درجہ رکھتے ہیں۔ان کی ذات اس جھوٹ سے قطعاً پاک ہے۔مغیرۃ بن الاخنس بھی ثقہ راوی ہیں۔پھر یہ جھوٹ کہاں سے آیا اور کس نے ان حضرات کی جانب اس جھوٹ کومنسوب کیا؟

جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ امام لیث سے اس روایت کونقل کرنے والا عبداللہ بن صالح ہے۔جو امام لیث بن سعد کا کاتب تھا۔تمام فساد کی ابتدا یہیں سے ہوئی ہے۔امام سعید بن منصور کا بیان ہے کہ یہ اتنا مغفل انسان تھا کہ اگر زمین پر کوئی کاغذ کا پرزہ مل جاتا اور اس میں کوئی روایت لکھی ہوتی تو اسے امام لیث اور امام زہری کی جانب منسوب کر دیتا۔امام ابن خزیمہ فرماتے ہیں۔یہ ایک پاگل انسان تھا۔اس کا پڑوسی اسکا دشمن تھا۔وہ کاغذ پر فرضی روایات لکھ کر اس کے گھر میں ڈال دیتا۔وہ اسے امام لیث کی روایت سمجھ کر امام لیث کا نام لے کر بیان کرتا۔نسائی کہتے ہیں وہ ثقہ نہیں ہے۔صالح جزرہ کہتے ہیں کذاب ہے۔علی بن المدینی فرماتے ہیں میں اس کی کوئی روایت قبول نہیں کرتا۔امام احمد فرماتے ہیں وہ ابتدا میں اچھا آدمی تھا۔لیکن آخر میں غلط احادیث بیان کرنی شروع کر دیں۔۲۲۲ھ میں اس کا انتقال ہوا۔(میزان جلد ۲،ص ۴۴۰) ابوالفضل المقدسی تذکرۃ الموضوعات میں فرماتے ہیں۔یہ عبداللہ بن صالح کذاب ہے۔روایات گھڑتا ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ نہ تو یہ روایت مغیرۃ بن اخنس نے بیان کی تھی نہ امام زہری نے اور نہ امام لیث اس کے ذمہ دار ہیں۔بلکہ عبداللہ بن صالح نے گھڑ کر یا کسی فرضی زمین پر پڑے ہوئے پرچہ کو دیکھ کر ان حضرات کی جانب منسوب کی اور یہ روایت دوسو سال بعد وجود میں آئی۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان حضرات محدثین کی ذات اس جھوٹ سے مبرّا ہے۔

امام لیث بن سعد بہت بڑے درجہ کے فقیہ اور بہت بڑے درجہ کے محدث ہیں،اور امام مالک کے ہم عصر ہیں۔امام شافعی فرماتے ہیں کہ لیث مالک سے زیادہ فقیہ اور عالم بالحدیث ہیں۔حتیٰ کہ انہوں نے حدیث میں امام مالک کی ستر غلطیاں پکڑیں اور امام مالک کو تحریر کر کے بھیجیں۔لیکن افسوس کہ امام لیث کو

اچھا شاگرد نہیں مل سکا۔ ورنہ آج روئے زمین پر امام لیث کا مسلک بھی پایا جاتا۔ محدثین اور فقہاء ان کی آراء جگہ جگہ نقل کرتے ہیں۔ امام لیث کی وفات شعبان ۱۷۵ھ میں ہوئی۔ یہ ہے اس روایت کی حقیقت جسے ہمارے ملا مجلس گرم کرنے کے لیے لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں۔ ان کی دکانداری اسی قسم کی فرضی روایات پر قائم ہے۔

بقیع کی کہانی

ہمارے علماء شب براءت کے موقعہ پر اپنے مضامین اور تقاریر میں جہاں متعدد فضائل کی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ ان میں انتہائی شدومد کے ساتھ قصۂ بقیع ضرور نقل کیا جاتا ہے اور اسے خصوصیت کے ساتھ اس لیے بیان کیا جاتا ہے کہ یہ وہ واحد کہانی ہے جو صحاح ستہ میں سے ترمذی اور ابن ماجہ میں پائی جاتی ہے۔ جہاں تک ابن ماجہ کا تعلق ہے۔ تو اسے صرف ہندو پاک کے کچھ متاخرین صحاح میں داخل سمجھتے ہیں۔ ورنہ اکثر محققین اور محدثین اسے صحیح کتاب قطعاً تصور نہیں کرتے۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز نے اسے تیسرے درجہ کی کتاب قرار دیا ہے اور حافظ ابن حجر، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اسے صحاح سے خارج قرار دیتے ہیں۔ امام نووی صرف پانچ کتابوں کو صحیح کہتے ہیں۔ علامہ ابن رشیق اندلسی صرف تین کتابوں کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ ابن الاثیر نے صحاح ستہ میں ابن ماجہ کے بجائے موطا امام مالک کو داخل کیا۔ ابن جوزی نے ابن ماجہ کی چالیس روایتوں کو موضوع قرار دیا۔ ذہبیؒ کہتے ہیں ابن ماجہ میں چالیس سے زیادہ موضوع اور ایک ہزار سے زائد منکر روایات پائی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ حافظ مزی نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ جو روایت صرف ابن ماجہ میں پائی جاتی ہو وہ ضرور منکر و مردود ہے اور حافظ ابن حجر اس قول کو نقل کر کے فرماتے ہیں اگرچہ یہ کوئی کلیہ نہیں لیکن ابن ماجہ کی اکثر روایات کی حالت یہی ہے۔ لہذا ابن ماجہ کا کسی روایت کو نقل کرنا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

جہاں تک ترمذی کا تعلق ہے تو وہ صاحب علم ہیں اور فن رجال سے واقفیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے

اپنا فریضہ کما حقہ ادا کر دیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس دور کے علماء ان کے فیصلہ کو بیان نہیں کریں اور شیر مادر سمجھ کر ہضم کر جائیں۔ اس لیے کہ اگر یہ علماء امام ترمذی کا وہ قول بھی نقل کر دیں تو قصہ بقیع کی تمام عمارت زمین کے برابر ہو جائے گی۔ پھر یہ مجمعے کیسے لگیں گے اور بازار میں ان کے مصنوعی مال کی مارکیٹ کیسے قائم ہوگی۔ امام ترمذی المتوفی ۲۷۹ھ نے اپنی کتاب میں یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے اس طرح نقل کیا ہے۔ جب نصف شعبان کی شب ہوئی (یہاں رات کا کوئی نام نہیں لیا گیا) تو میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے بستر پر نہیں پایا۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیچھا کیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بقیع میں کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوٹے اور فرمایا۔ اے عائشہ کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیرے ساتھ زیادتی کرے گا۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں یہ نہیں سمجھتی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی کسی اور زوجہ کے پاس تشریف لے گئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ تجھے معلوم ہے آج کونسی شب ہے۔ آج نصف شعبان کی شب ہے۔ اس رات میں اللہ تعالی بنو کلب کی بھیڑوں کے بالوں سے بھی زیادہ لوگوں کی مغفرت فرماتا ہے۔ اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہو گیا کہ سورۃ دخان کی آیات میں لیلۃ مبارکہ سے یہ بے نام رات مراد نہیں تھی۔ اگر یہ رات مراد ہوتی تو اولاً تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بیان کرنا چاہیے تھا۔ ثانیاً ام المؤمنین بھی اس سے ہرگز لاعلم نہ ہوتیں۔ کیونکہ یہ آیات اس واقعہ سے ایک طویل عرصہ قبل نازل ہو چکی تھیں۔ کیا کہانی نویس یہ کہنا چاہتا ہے کہ ام المؤمنین اتنی کم فہم تھیں کہ اس آیت کے مفہوم کو بھی نہیں سمجھ سکیں جو ایک عرصہ دراز قبل نازل ہو چکی تھیں؟ گویا یہ ام المؤمنین پر ایک مخفی تبرا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کیونکہ یہ رات تبراء کی رات ہے۔

ہمارے علماء اس سے استدلال پیش کرتے ہیں کہ اس رات قبرستان جانا اور مُردوں کے لیے دعائے مغفرت کرنا سنت رسول اور کار ثواب ہے۔ ہماری گزارش یہ ہے کہ کیا بیوی کا پیچھا کرنا بھی سنت ہے؟ اگر آپکا جواب نفی میں ہے تو جس روایت پر کلی طور پر آپ خود عمل نہیں کرتے اسے دوسروں کے سامنے بطور دلیل کیوں پیش کرتے ہیں۔ اور بیچاری صنف نازک نے ایسا کونسا قصور کیا جو اسے کارِ خیر سے محروم رکھا گیا اور

اگر آپکا جواب اثبات میں ہے یعنی آپ اس کے قائل ہیں کہ بیوی کو بھی مرد کا پیچھا کرنا چاہیے تو ہم نے آپ کو یہ تعلیم دیتے نہ کبھی سنا اور نہ کبھی پڑھا کہ عورتوں کو چاہیے کہ وہ خاموشی سے مردوں کا پیچھا کیا کریں۔ کیونکہ مرد کی ذات بھروسہ کے قابل نہیں اور جب آپ اس کی تعلیم نہیں دیتے تو گویا آپ نے قصداً صنف نازک کو ایک کارِ خیر سے محروم رکھا۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اگر آپ نے عورتوں کو یہ تعلیم دی تو اس کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ آپ کو اس کا علم نہ ہو کہ آپ کی بیوی آپ کا پیچھا کر رہی ہے۔ اس صورت میں آپ دونوں حضرات ثواب سے محروم ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس جاسوسی سے کیا حاصل جسکا علم اس شخص کو بھی ہو جسکی جاسوسی کی جارہی ہے۔ ہم تو کم از کم اس روایت کا یہی مفہوم سمجھے ہیں کہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر بھی بھروسہ نہ تھا اور اس عدم اعتماد کا اظہار آپ اپنی زبان سے بھی کر رہی ہیں۔ اس سے بڑھ کر تبراء کیا ہوگا؟ یعنی لیلۃ البراءت کا صحیح تصور پیش کر دیا گیا۔

آپ حضرات سے مزید سوال یہ بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموشی سے تشریف لے گئے اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو نہ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مطلع کیا نہ چلتے وقت مطلع کرنا پسند کیا اور نہ لوگوں میں پہلے سے اس کا اعلان کیا۔ کیونکہ اگر پہلے سے اعلان ہوتا تو ام المؤمنین کو بھی اطلاع ہوتی اور وہ ہرگز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیچھا نہ کرتیں۔

یہ تمام امور اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ عمل اُمت سے مخفی رکھنا چاہتے تھے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ عمل نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھا اور اُمت کے لیے اس پر عمل کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ اگر یہ عمل اُمت کہ لیے بہتر ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے سے اسکی تعلیم دیتے اور ام المؤمنین کو بھی مطلع فرماتے۔ ایسی صورت میں اس پر عمل کرنا اور قبرستان کے چکر کاٹنا سراسر سنت کے مخالفت ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخصوص افعال میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتدا نہیں ہوتی اور اگر یہ حکم عام تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے باوجود اس حکم کو اُمت اور ام المؤمنین سے چھپایا تو اس صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ الزام آئے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت میں خیانت سے کام لیا۔ **فلعنۃ اللہ علی الکاذبین**

الغرض اس روایت کی ناک جس طرح چاہے موڑ کی دیکھو کسی نہ کسی پر تبراء ضرور ثابت ہوگا اور حقیقت یہ ہے کہ اتنی عقل کی بات باطنی اور تقیہ کے ماہرین تو ضرور کر سکتے ہیں۔ لیکن سیدھے سادھے ملا کے بس کی بات نہیں۔ پھر اس روایت میں کہیں موجود نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی عبادت فرمائی تھی یا ام المؤمنین کو اس کا حکم دیا تھا۔ کیا صرف قبرستان کا چکر لگانے سے مغفرت حاصل ہوگئی اگر اس کا اقرار کرتے ہو تو اس سے ثابت ہوگا کہ رات کی شب بیداری، دن کا روزہ، چراغاں کی صورت میں دیوالی اور حلوؤں کی صورت میں چڑھاوے سب مہملات ہیں۔ کیونکہ مغفرت تو صرف قبرستان جانے سے ہو چکی ہے۔ اور اگر کہتے ہو کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور حرکات بھی ضروری ہیں تو اس روایت میں ان امور کا کوئی تذکرہ نہیں۔ نیز یہ بھی غور طلب ہے کہ قبرستان جانے سے کس کی مغفرت ہوتی ہے۔ زندوں کی یا مُردوں کی۔ اس کا فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں، وہ پہلے اس کا فیصلہ اپنے اپنے علماء سے کرائیں۔

یہ تو اس روایت کی معنوی حیثیت ہے اب اس کی سندی حیثیت خود امام ترمذی کی زبانی سنیے جسے ہمارے علماء بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اور ہمارا تخیل تو یہ ہے کہ وہ یا تو اسے سمجھنے کی قدرت نہیں رکھتے یا اسے عمداً بیان نہیں کرتے۔

امام ترمذی فرماتے ہیں میں نے محمد بن اسمعیلؒ (بخاری) سے سنا وہ اس حدیث کو ضعیف کہتے تھے اور انہوں نے فرمایا کہ یہ روایت حجاج بن ارطات یحیٰ بن ابی کثیر سے نقل کر رہا ہے حالانکہ اس نے یحیٰ سے زندگی میں ملاقات تک نہیں کی۔

امام ترمذی فرماتے ہیں یحیٰ اس روایت کو عروہ سے نقل کر دیتے ہیں۔ اور یحیٰ نے عروہ سے بھی کبھی ملاقات نہیں کی۔ اس طرح یہ روایت دو مقام سے منقطع ہوئی اور منقطع روایت محدثین کے نزدیک نا قابل قبول ہے اور جو روایت دو جگہ سے منقطع ہو وہ محدثین کے نزدیک معضل کہلاتی ہے اور جو انتہائی شدید قسم کی ضعیف بلکہ منکر و مردود ہوتی ہے۔ اسی لیے حافظ بدرالدین عینی حنفی، ابن دحیہ اور ابن العربی مالکی نے اسے موضوع قرار دیا۔ اور روایت میں صرف یہی دو عیوب نہیں بلکہ ان دو عیوب کے علاوہ مزید دو عیوب پوشیدہ

ہیں۔ ① حجاج اور یحیٰ دونوں مدلس ہیں یعنی درمیان سند سے عمداً راوی کو حذف کر دیتے ہیں تا کہ روایت کا عیب ظاہر نہیں ہو۔ کیونکہ درمیان سے جو راوی گرایا جاتا ہے وہ اکثر و بیشتر نا قابل اعتبار ہوتا ہے۔ اسی لیے راوی اس کا نام چھپا دیتا ہے۔ ممکن ہے جو راوی درمیان سے گرائے گئے ہوں وہ تبرائی ہوں اور پھر جب کسی جگہ سے راوی گرایا جاتا ہے تو بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو راوی گرایا گیا ہے وہ صرف ایک نہیں ہوتا بلکہ متعدد ہوتے ہیں اور حجاج اور یحیٰ دونوں کی عادت میں یہ داخل ہے کہ وہ درمیان سے راوی گرا دیتے ہیں ۔اس لیے امام ترمذی نے کتاب العلل میں امام یحیٰ بن سعید القطان کا قول نقل کیا ہے۔

و مُرسلات یحیٰ بن ابی کثیر لیس بشی ''اور یحیٰ بن ابی کثیر کی مُرسلات کچھ نہیں ہیں۔''

جب یحیٰ کی مرسل کوئی درجہ نہیں رکھتی تو حجاج بن ارطات اس سے کہیں زیادہ گیا گزرا ہے۔ اس لیے کہ یحیٰ کی تو صرف مرسلات نا قابل قبول ہیں جب کہ حجاج کی تو روایت ہی قابل قبول نہیں ہوتی۔ اور مدلس جب کوئی روایت عن فلان کہہ کر نقل کرتا ہے تو وہ روایت قابل قبول نہیں ہوتی اور یہاں بھی دونوں نے عن کے ذریعہ نقل کیا ہے۔

② حجاج بن ارطات تمام محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ یہ اسلام میں سے پہلا شخص ہے جس نے رشوت خوری کی بنیاد رکھی۔ خلیفہ مہدی عباسی سے قبل یہ ایک فقیر تھا۔ مہدی نے اسے قاضی بنا دیا۔ قضا مل جانے کے بعد اس نے جماعت سے نماز پڑھنی چھوڑ دی اور کہا کرتا تھا کہ کیا قصائیوں اور سقوں کے ساتھ ایک صف میں کھڑا ہو جاؤں؟ امام شافعی نے اسکا یہ بھی قول نقل کیا ہے کہ انسان کی بڑائی اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک وہ نماز با جماعت ترک نہیں کر دے ایسے راویوں پر اگر شریعت کے معاملہ میں اعتبار کر لیا جائے تو قرآن کو بھی لپیٹ کر رکھنا پڑے گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ﴾ (سورہ حجرات:٦)

''اے ایمان والو اگر کوئی فاسق تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لو کہ کہیں کسی قوم کو

بے جا ایذا نہ دے بیٹھو، پھر اپنے کیے پر پچھتاتے رہ جاؤ۔''

اسی لیے تمام آئمہ محدثین وفقہا کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر روایت کے راویوں کی چھان بین اور ان کی حالت کی تحقیق دین میں داخل ہے۔ امام محمد بن سیرین المتوفی سنہ ۱۱۰ھ فرماتے ہیں:

هذا الاسناد دين فانظروا عمن تأخذون دينكم (صحیح مسلم ج ۱، ص ۱۱)

''یہ سند بھی دین ہے پہلے اس پر غور کرلیا کرو کہ تم اپنا دین کس قسم کے لوگوں سے اخذ کر رہے ہو۔''

اگر یہ سندات اور راویوں پر بحث نہ ہوتی تو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے نام پر جس کا جو دل چاہتا کہتا پھرتا۔ جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے، عبداللہ بن المبارک فرماتے ہیں۔

لو لا الإسناد لقال من شاء ماشاء (مسلم ج ۱، ص ۱۲)

''اگر سند نہ ہوتی تو جس کا جو جی چاہتا بکتا۔''

اللہ تعالی محدثین کرام کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے صحت حدیث کیلیے ایک ایک راوی کے حالات معلوم کر کے لاکھوں راویوں کے حالات ہمارے سامنے جمع کر کے رکھ دیے۔ اسی فن کا نام علم الرجال والاسناد ہے پھر روایت کے لحاظ سے احادیث کے مختلف درجات قائم کیے اور ان کے اصول وضع کیے۔ جس سے فن علم اصول حدیث اور فن علم الروایت وجود میں آئے۔ پھر جرح وتنقید کا طریقہ کار وضع کیا۔ جس کا نام علم الجرح والتعدیل ہے۔ عقل کی رو سے کسی روایت پر جو اعتراضات وارد ہو سکتے تھے، ان کے لیے اصول وضع کئے جس کا نام علم الدرایہ رکھا گیا۔ روایت کی پوشیدہ خامی ظاہر کرنے کے لیے علم العلل وضع کیا گیا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کسی راوی کی کس سے ملاقات ہے علم التاریخ کو اختیار کیا گیا۔ امام سفیان ثوری کا ارشاد ہے:

إذا كذب الناس فاستعملنا التاريخ

(جب لوگوں نے جھوٹ بولنا شروع کر دیا تو ہم نے تاریخ کا استعمال شروع کر دیا۔)

اگر ایک نام کے متعدد راوی ہوں تو ان کا فرق معلوم کرنے کے لیے علم الانساب علم الاسماء والکنی اور علم المشتبہ جیسے فنون ایجاد کئے گئے ان فنون کو حاصل کرنے کے لیے اور ان میں عبور پیدا کئے بغیر اگر کوئی شخص اپنی حدیث دانی کا دعویٰ کرتا ہے وہ یقیناً عالم کے روپ میں ایک دکاندار ہے۔ جو کاروبار چمکانے کے لیے محدثین کرام کی ان مساعی جمیلہ پر پانی پھیرنا چاہتا ہے یا اول درجہ کا احمق و دجال ہے۔ اسی لیے ہم نے اس مضمون میں ان تمام فنون کو پیش نظر رکھا ہے۔ ہم نے اپنی جانب سے کسی نئی بات کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ محدثین نے اس سلسلہ میں جو فرمایا ہے وہ ہم نے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ہم تو صرف اتنی سی بات کے ضرور مجرم ہیں کہ ہم نے محدثین کے اقوال کو اُردو جامہ پہنا کر اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ اب اگر ہمیں کوئی مجرم تصور کرتا ہے تو اس جرم کو ہم خوش دلی سے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔

ہاں ہم یہ سوال ضرور کرنا چاہیں گے آپ کو انہیں روایتوں سے کیوں پیار ہے جن کے راویوں کو محدثین نے کذاب، رافضی، خارجی، راشی اور خبیث قرار دیا ہو۔ کہ لیلۃ مبارکہ کی تفسیر میں آپ نے ایک خارجی کذاب کے قول کو اختیار کیا اور قبرستان کے چکر لگانے میں ایک راشی کی روایت کو۔ آپ کا ان سے کیا روحانی رشتہ ہے؟ اگر ہمارے علماء نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک فرمان کو پیش نظر رکھیں جو امام حضرت مغیرۃ بن شعبہؓ اور حضرت سمرۃ بن جندبؓ سے روایت کیا ہے تو شاید ان میں بھی حدیث کے معاملہ میں احتیاط کا مادہ پیدا ہو جائے۔ ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع (صحیح مسلم ج ۱، ص ۸)

''آدمی کا جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی بات بیان کرنے لگے۔''

بقیع کا قصہ جہاں عقلاً نقلاً غلط ہے جیسا کہ آپ حضرات سطور بالا میں پڑھ چکے ہیں وہاں سراسر احادیث صحیحہ اور تاریخ کے بھی خلاف ہے۔ مؤطا امام مالک اور سنن نسائی میں صحیح سند کے ساتھ اس واقعہ کی صورت یہ بیان کی گئی ہے۔ ام المؤمنین فرماتی ہیں:

قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذات لیلۃ فلبس ثیابہ ثم خرج قالت فامرت جاریتی بریرۃ

تبتعه فتبعه جاء البقیع فوقف فی او قام ماشاء اللہ ان یقف ثم انصرف فسبغته بریرة فاخبرتنی فلم از کر له شئیا حتی اصبح ثمذ کرت له فقال انی بعثت ال اهل البقع لا صلی علیهم (نسائی ج/۱،ص/۲۰۶ ومؤطاامام مالک ص/۸۵)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک رات اٹھے پھر اپنے کپڑے پہنے اور باہر تشریف لے گئے۔ام المؤمنین کہتی ہیں میں نے اپنی باندی بریرہ کو حکم دیا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیچھا کرے۔وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے گئی حتی کہ آپ بقیع پہنے اور در لے کنارے کھڑے ہوئے۔جب تک اللہ نے چاہا کھڑے رہے۔پھر واپس لوٹے۔بریرہ پہلے پہنچ گئی۔اس نے مجھے اطلاع دی۔میں نے صبح تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی ذکر نہیں کیا۔صبح کے بعد میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ذکر کیا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مجھے اہل بقیع کی جانب بھیجا گیا تھا۔تاکہ میں ان کیلیے دعائے مغفرت کروں۔''

یہ حدیث صحیح علی الاعلان یہ ثابت کر رہی ہے کہ نہ ام المؤمنین نے پیچھا کیا تھا۔اور نہ شب تبراء کی کوئی خوبی بیان کی گئی تھی اور نہ شب مخصوصہ کے باعث آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بقیع تشریف لے گئے تھے۔بلکہ وہاں جانے کی صرف وجہ یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اہل بقیع کے لیے دعائے مغفرت کا حکم دیا گیا تھا اور یہ حکم قرآن میں صراحتاً موجود ہے۔ارشاد ہے:

﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ (سورہ براءت: ۱۰۳)

''اوران کے لیے دعائے رحمت کیجیے، بیشک تمہاری دعا ان کے لیے سکون کا باعث ہے۔''

گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حکم الٰہی پر عمل کرنے کے لیے بقیع تشریف لے گئے تھے۔یہاں یہ اختلاف تو ضرور ہوسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دعائے مغفرت کا حکم دیا گیا ۔یا نماز جنازہ کا۔کیونکہ لفظ صلاۃ دونوں معنی میں مشتمل ہے۔

تاریخی لحاظ سے یہ واقعہ کب پیش آیا۔کون سا سن تھا،کون سا مہینہ تھا اور کون سا دن تھا۔ہم جب اس

پرغور کرتے ہیں تو اتنی بات تو مسلمہ ہے کہ یہ واقعہ ۱۰ھ سے قبل پیش نہیں آیا۔ کیونکہ یہ آیت کریمہ ۹ھ ماہ شعبان میں دوران سفر نازل ہوئی۔ جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے اور پندرہ شعبان کے بعد مدینہ واپس پہنچے، اگر یہ واقعہ ۹ھ میں پیش آیا تو آخر شعبان میں پیش آیا ہوگا۔ ورنہ ۱۰ھ میں پیش آیا اور ۱۱ھ میں شعبان کی آمد سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحلت فرما گئے۔ بشرطیکہ اس کا تعلق شعبان سے ہو، حالانکہ شعبان سے اسکا کوئی تعلق نہیں۔

رہا مہینہ اور تاریخ کا مسئلہ تو موطا امام مالک کے حاشیہ پر محلی کے حوالہ سے ابن الوضاح کا یہ قول منقول ہے:

قال ابن الوضاح کانت القصة قبل موته بخمسة ایام (مؤطا ص/ ۸۵)

''ابن الوضاح کہتے ہیں یہ واقعہ موت رسول سے پانچ روز قبل پیش آیا۔''

یعنی یہ واقع آپ کی وفات سے پانچ روز قبل پیش آیا۔ نہ شعبان میں۔ اس وقوعہ کی تاریخ کیا تھی۔ اس فیصلہ کا دارومدار اس بات پر موقوف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کون سی تاریخ کو ہوئی۔ بارہ کی روایت جو ہمارے یہاں مشہور ہے وہ تو قطعاً غلط ہے۔ جو خلاف عقل بھی اور خلاف نقل بھی۔ مورخین کے وفات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تین اقوال ہیں ۲/ ربیع الاول، ۱/ ربیع الاول اور ۹/ ربیع الاول۔ پہلے دو اقوال کے لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخر صفر میں بقیع تشریف لے گئے اور ۹/ ربیع الاول کے لحاظ سے شروع ربیع الاول میں۔ الغرض شعبان میں بقیع جانے کی کہانی الف لیلیٰ کی داستان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔

جس تاریخ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بقیع تشریف لے گئے تھے۔ اس روز دن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میدان اُحد تشریف لے گئے۔ صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کا بیان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آٹھ سال بعد اُحد تشریف لے گئے میرے والد کی قبر کھل گئی تھی۔ پورا جسم محفوظ تھا۔ لیکن ناک کا کچھ گوشت اڑ گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ آٹھ سال کی مدت بالکل آخر عمر میں ہوگی اور وہ بھی پورے آٹھ سال نہ ہوں گے۔ چالُو سال کو بھی سال شمار کیا گیا۔ کیونکہ جنگ اُحد ۶/ شوال ۳ھ میں واقع ہوئی۔ بخاری اور ابو داؤد نے حضرت عقبہ بن

عامر الجہنیؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے ساتھ احد تشریف لے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہدائے احد کی نماز جنازہ ادا کی اور واپس تشریف لا کر ہمیں اس قسم کا خطبہ دیا گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندوں اور مُردوں سب کو رخصت کر رہے اور آخر میں فرمایا:

انی فرطکم علی الحوض

''میں تمہارا حوض پر پیش رو ہوں گا۔''

امام بخاری نے اس سے شہداء کی نماز جنازہ کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں مورخ محمد بن اسحاق سے نقل کیا ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات سے پانچ روز پیشتر جمعرات کے دن اُحد تشریف لے گئے۔ قاضی عیاض مصری نے الشفاء میں، امام نووی نے شرح مسلم میں اور علامہ شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم شرح صحیح مسلم جلد سوئم میں، اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری شرح صحیح البخاری میں یہی دعویٰ کیا ہے۔ بلکہ قاضی عیاض شرح مسلم میں یہاں تک فرماتے ہیں:

ای فی اٰخر عمرہ لا قبل یدل علیہ أحادیث اخر

''یعنی آخر عمر میں نہ کہ اس سے قبل جیسا کہ اس پر دیگر احادیث دلالت کرتی ہیں۔''

یہ تمام ائمہ یہ دعوے کر رہے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بقیع رات کے وقت وفات سے صرف چند روز پیشتر تشریف لے گئے اور اس سے قبل کبھی تشریف نہ لے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ حجاج بن ارطات والی کہانی کا علم ان حضرات کو بھی ہوگا۔ اگر وہ کہانی ان حضرات کی نظر میں صحیح ہوتی تو وہ ہرگز یہ دعویٰ نہ کرتے۔ یہ دعویٰ اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ ان حضرات نے اس کہانی کو نا قابل اعتبار سمجھا ہو۔ ورنہ کوئی نہ کوئی تو یہ دعویٰ کرتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے قبل شعبان میں بھی تشریف لے گئے تھے۔ لیکن قاضی عیاض نے یہ کہ کر کہ زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی رات کو تشریف نہ لے گئے تھے، صرف آخر عمر میں تشریف لے گئے، جیسا کہ دیگر احادیث اس کی شہادت دے رہی ہیں، ہر تخیل کو باطل کر دیا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے قاضی عیاض کا یہ قول نقل کر کے سکوت اختیار کیا۔ گویا ان کے نزدیک قاضی عیاض کا دعویٰ بالکل صحیح اور درست تھا۔

میرے والد اور استاد محترم مفتی اشفاق الرحمان کاندھلوی مرحوم۔ صدر مدرس مدرسہ فتحپوری دہلی اور صدر مدرس دار العلوم ٹنڈالہیارو سابق مفتی اعظم ریاست بھوپال اپنی کشف المغطا شرح الوٴطاء میں اس واقعہ پر بحث کرتے ہوئے علامہ ابن عبدالبر مالکی کا حوالہ بھی پیش کرتے ہیں۔ کہ ابن عبدالبر نے حضرت ابو مویہہؓ صحابی سے نقل کیا ہے کہ میں اس رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں جا کر اہل بقیع کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔ اس کے بعد میری جانب متوجہ ہوئے اور مجھ سے فرمایا۔ اے ابو مویہہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دو باتوں کا اختیار دیا ہے کہ یا تو میں دنیا کے خزانے اور دنیا کی زندگی کو پسند کرلوں اور خواہ میں جنت اور اپنے پروردگار کی ملاقات اختیار کرلوں۔ میں نے اپنے پروردگار کی ملاقات کو اختیار کرلیا۔

آخر میں ابومویہہؓ کا بیان ہے:

فاصبح من تلک اللیلة بک بدا وجعه الذی مات منه صلی الله علیه وسلم

(کشف المغطا ص/ ۲۲۴)

''اسی رات کی صبح سے حضور کو وہ تکلیف شروع ہوئی جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موت واقع ہوئی۔''

مجھ پر تو یہاں الزام ہے کہ میں لوگوں کے سامنے وہ چیز پیش کر رہا ہوں جو آج تک کسی نے پیش نہ کی تھی۔ میرا جرم یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جو دعوے تم کر رہے ہو وہ کسی نے نہ کیا تھا۔ حالانکہ اتنے ائمہ اور علماء کی اتنی طویل فہرست آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ یہ جرم صرف مجھ پر عائد نہیں ہوتا۔ بلکہ تمام محدثین اور ائمہ پر بھی عائد ہوتا ہے۔ میرے لیے انہیں مجرم قرار دینا دشوار ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ موجودہ دور کے علماء کو کتمان حق کا مجرم تصور کرلوں۔ یہ زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ ان تمام علماء کا علم ان آئمہ اور محدثین میں سے کسی ہستی کے مساوی نہیں ہوسکتا۔ جب ہمیں تقلید کا لبادہ ہی اوڑھنا ہے تو کیوں نہ کسی ماہر فن کی تقلید کی جائے۔ یہ کیا کہ راہ چلتے کی تقلید شروع کردی جائے۔ میں کسی صورت میں بھی آئمہ کی تقلید چھوڑ کر جہلا کی تقلید اختیار نہیں کرسکتا۔

یہ بھی ایک غور طلب امر ہے کہ ۸ھ تک یعنی عمرہ جعرانہ تک زیارت قبور کی قطعاً ممانعت تھی۔لیکن جب عمرہ کے دوران جو ذی القعدہ ۸ھ میں ہوا۔آپ ﷺ کا گزر آپ ﷺ کی والدہ کی قبر پر سے ہوا تو آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے دعائے مغفرت کی اجازت طلب کی،جس کی آپ ﷺ کو ممانعت کر دی گئی ۔آپ ﷺ نے زیارت قبر کی اجازت طلب کی تو اس کی اجازت دے دی گئی ۔ آپ ﷺ قبر پر تشریف لے گئے اور آپ ﷺ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

کنت نهیتکم عن زیارة القبور فزورها فانهاتذکرکم الموت (مسلم ج/۱،ص/ ۳۱۴)

''میں نے تم کو زیارت قبور سے منع کیا تھا، اب تم ان کی زیارت کر سکتے ہیں ، کیونکہ یہ زیارت تمہیں موت کی یاد دلائے گی۔''

یہ واقعہ تمام کتب صحاح میں حضرت بریدہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ سے مروی ہے۔اور جب ۸ھ سے قبل زیارت قبور ممنوع تھی تو یہ ناممکن ہے کہ حضور ﷺ اس سے قبل زیارت کے ارادے سے بقیع تشریف لے گئے ہوں گے۔ظاہر ہے کہ یہ وقوعہ ذی القعدہ ۸ھ کے بعد ہی پیش آ سکتا ہے۔

اس پر تمام مؤرخین ومفسرین اور محدثین کا اتفاق ہے کہ ازواج مطہرات کے لیے پردہ کا حکم ۵ھ میں نازل ہوا۔اور واقعہ ایلا یعنی جب حضور ﷺ نے ازواج سے علیحدگی اختیار کی تھی یہ وقوعہ ۵ھ میں پیش آیا۔اور اس واقعہ کے تحت جو آیات نازل ہوئیں ان میں ازواج مطہرات کو حکم دیا گیا:

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ﴾ (سورہ احزاب: ۳۳)

''اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور بے پردہ نہ رہو جیسے کہ اگلی جاہلیت کی بے پردگی۔''

کیا ایسی صورت میں ممکن ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ بلا شرعی عذر گھر سے صرف حضور ﷺ کا پیچھا کرنے کے لیے نکلیں۔اُم المؤمنین کے بارے میں ایسا گمان کوئی بد باطن تو کر سکتا ہے۔لیکن کوئی بیٹا اپنی ماں پر اتنا بڑا الزام قائم نہیں کر سکتا۔

اگر کوئی احمق یہ کہے کہ زیارت قبور کی اجازت دے دی گئی تو اب ان کے جانے پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے تو اس کے لیے ابن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ کی حدیث رسول کافی ہے:

لعن اللہ الزوارات القبور (ترمذی ج/۱،ص/۱۰۸)

''اللہ قبروں کی زیارت کرنے والیوں پر لعنت بھیجتا ہے۔''

ایسی صورت میں یہ ناممکن ہے کہ ام المؤمنین نے حضور کا پیچھا کیا ہو، بلکہ یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بدنام کرنے کی ایک بھرپور سعی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک مخفی تبرا ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ تبرائیوں نے سنیوں کے ذریعہ ان کی ماں پر تبرا کرایا۔ اور خود علیحدہ ہوکر بیٹھ گئے۔ اب بھی کوئی نہ سمجھے تو اسے خدا سمجھے۔ اگر قارئین کو مزید تفصیلات کی ضرورت ہے تو ہماری کتاب ''شب براءت اور اسکی حقیقت'' کا انتظار کریں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت

شب براءت کے سلسلے میں ایک اور روایت ابن ماجہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں نقل کی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی شب میں طلوع فرماتا اور مشرک اور کینہ پرور کے علاوہ سب کی مغفرت فرماتا ہے۔''

نزول الٰہی کا ذکر تو بچپن سے سنتے آئے تھے اور احادیث صحیحہ میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ لیکن یہ طلوع الٰہی کیا شے ہے، اور اس کا مفہوم کیا ہے؟ ہم اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس لیے قرآن اور حدیث صحیح میں ہم نے آج تک اس کا ذکر نہیں پڑھا اور نہ کسی محدث وفقیہ نے اس کے معانی ومفہوم پر بحث کی۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ طلوع وغروب کا تعلق چاند، سورج اور مجسم اشیاء سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات جسم سے منزہ ہے۔ اگرچہ شیعوں کے متعدد فرقے مثلاً مجسمہ مشبہہ اور نصیریہ وغیرہ اللہ کے مجسّم ہونے کے قائل

ہیں اور صوفیاء کے یہاں بھی مشاہدہ حق کے بغیر کوئی بات نہیں بنتی۔

یہ بھی ایک حقیقت مسلمہ ہے کہ جو شے طلوع ہوتی ہے وہ غروب بھی ضرور ہوتی ہے اور جو شے طلوع و غروب ہوتی ہو وہ یقیناً ایک نہ ایک دن فنا بھی ضرور ہوتی ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراھیمؑ کے ذریعہ ستارے کے غروب ہونے کے وقت یہ اعلان کرایا:

﴿إنی لا احب الافلین﴾ (سورہ انعام: ۷۷)

''یقیناً میں ڈوبنے والے کو پسند نہیں کرتا۔''

جو اللہ طلوع ہوتا ہے اور صبح صادق کے ظہور کے بعد غروب ہوجاتا ہو۔ ایسا اللہ وہ اللہ تو ہرگز نہیں ہوسکتا جس نے قرآن میں اپنا یہ وصف بیان کیا ہو:

﴿لیس کمثلہ شئ﴾

''اس کی مثل کوئی شئے نہیں۔''

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اس روایت میں اس شب کا کوئی نام مذکور نہیں۔ بلکہ نصف شعبان درج ہے۔ اگر مہینہ تیس دن کو ہو تو یہ پندرھویں شب ہوگی۔ اور اگر مہینہ انتیس کا ہے تو نصف شعبان کی کوئی بھی شب نہ ہوگی۔ حالانکہ ہمارے علماء اور عوام ایک متعینہ شب میں یہ کام انجام دیتے ہیں۔ انہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ مہینہ تیس کا ہوگا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جس سال شعبان انتیس کا ہوگا۔ اس سال عبادت تو اکارت گئی۔ کیونکہ نصف شعبان واقع ہی نہیں ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس قسم کی روایات گھڑنے والے عقل سے کورے تھے۔

اس روایت کی محدثین کی نظر میں کیا حیثیت ہے۔ تو اس کا ناقل عبداللہ بن لہیعہ ہے۔ اس کا انتقال ۱۷۴ھ میں ہے۔ بخاری و مسلم نے اس کی کوئی روایت نقل نہیں کی۔ ترمذی نے اس کی روایت نقل کر کے اسے ضعیف قرار دیا۔ نسائی نے دعویٰ کیا کہ میں نے کتاب میں اس کی صرف ایک روایت نقل کی ہے اور وہ بھی مجبور ہوکر۔ مقدسی کہتے ہیں متروک ہے۔ امام ابوزرعہ رازی فرماتے ہیں کذاب ہے۔ دیگر محدثین کہتے

ہیں کہ اگر اس سے عبداللہ بن مبارک اور عبداللہ بن اسواریری حدیث نقل کریں تو قابل قبول ہوگی۔ ورنہ قطعاً نہیں۔ کیونکہ آخر عمر میں اس کے دماغ نے جواب دے دیا تھا جس کے باعث الٹی سیدھی روایات بیان کرنے لگا۔ اور اتفاق سے یہ روایت یہ دونوں حضرات نقل نہیں کر رہے ہیں۔ ابن عدی اور ذہبی کہتے ہیں ابن لہیعہ کی یہ روایت منکر ہے۔ عبداللہ بن لہیعہ نے یہ روایت کس سے سنی، تو کبھی تو وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ روایت زید بن سلیم سے مروی ہے اور کبھی کہتا ہے ضحاک بن ایمن سے مروی ہے۔ یہ دونوں حضرات کون ہیں امام بن عدی ذہبی اور ابن حجر لکھتے ہیں کہ زید بن سلیم مجہول شخص ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ کون بلا ہے۔ عبداللہ بن لہیعہ کے علاوہ اس کا کوئی ذکر تک نہیں کرتا۔ اور اس نے صرف اسی روایت میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اتفاق سے یہی بات محدثین نے ضحاک بن ایمن کے بارے میں بھی کہی ہے۔ یعنی دونوں فرضی ہیرو ہیں۔ جن کا بظاہر کوئی وجود نہیں گویا یہ صرف بن لہیعہ کی ذہنی پیداوار ہیں۔

عبداللہ بن لہیعہ آگے چل کر دعویٰ کرتا ہے کہ ان دونوں نے یہ روایت ضحاک بن عبدالرحمان بن عرزب سے نقل کی ہے اور کبھی کہتا ہے کہ عبدالرحمان بن عرزب سے نقل کی ہے اور اتفاق سے یہ دونوں بھی مجہول ہیں۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عبداللہ بن لہیعہ نے یا تو یہ روایت اپنے دماغ کی بھٹی میں تیار کی یا یہ روایت اس وقت کی ہے جب اسے ہذیان کے دورے پڑنے لگے تھے۔ اس طرح اس روایت کے چار راوی تو قطعا مجہول ہیں اور ایک شدید ضعیف ہے۔ یہ روایت تو ردی کی ٹوکری میں پھینکنے کے قابل بھی نہیں ہے۔

یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ زید بن سلیم، ضحاک بن ایمن، ضحاک بن عبدالرحمٰن اور عبدالرحمن بن عرزب سے ابن ماجہ کے علاوہ کسی محدث نے روایت نہیں لی اور نہ اس روایت کو ابن ماجہ کے علاوہ کسی نے نقل کیا۔ اور حافظ مزی فرماتے ہیں جو روایت صرف ابن ماجہ نقل کریں اور وہ کسی اور کتاب میں نہ ہو وہ یقیناً منکر ہے۔ اس روایت کو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہنا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صریح تہمت ہے۔ اس کا تو بیان کرنا بھی حلال نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی شے کو بیان کرنے سے قبل دو باتوں کا حکم دیا ہے۔

اول یہ کہ بات سچی ہو، دوئم یہ کہ اسے انسان جانتا ہو۔ارشاد ہے:

﴿إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ (سورہ زخرف:۸۶)

''مگر جو لوگ حق کی شہادت دیں اور وہ علم بھی رکھتے ہوں''

اور چونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس روایت کے راوی نا قابل اعتبار ہیں۔اس لیے اس کے حق ہونے کا سوال بھی پیدا نہ ہوتا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت

اس سلسلہ کی اور روایت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب کی جاتی ہے۔جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی شب میں آسمان دنیا کی جانب نزول فرما ہوتا ہے اور مشرک اور کینہ پرور کے علاوہ ہر شخص کی مغفرت فرماتا ہے۔''

یہ روایت کتب حدیث میں قطعاً نہیں پائی جاتی جبکہ ابن عدی نے اس روایت کو اپنی ''کامل'' میں نقل کر کے اسے منکر قرار دیا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ ابن عدی کی ''کامل'' حدیث کی کوئی کتاب نہیں۔بلکہ یہ علم رجال کی ایک مسلمہ کتاب ہے۔علم الرجال وہ فن ہے جس میں حدیث کے راویوں کے حالات بیان کئے جاتے اور ان کی ذات اور ان کی روایات پر بحث کی جاتی ہے۔یہ ایک ایسا فن ہے جو دنیا کی دیگر اقوام میں قطعاً نہیں پایا جاتا۔گویا یہ انسانوں کی انسائیکلو پیڈیا ہے۔اس کی وضع کا سہرا محدثین کرام کے سر ہے۔اور سب سے پہلے اس فن پر تصنیف امام یحی بن سعید القطان نے فرمائی۔جن کی وفات ۱۹۵ھ میں ہے۔اس سے قبل یہ فن زبانی طور پر دور صحابہ سے جاری تھا۔اسی فن کے ذریعہ روایت کی صحت وضعف کا حکم لگایا جاتا ہے۔اس فن پر سینکڑوں کتابیں تصنیف کی گئیں۔ان مصنفین نے اپنی اپنی تصنیفات میں خاص خاص موضوعات کو پیش نظر

رکھا ہے۔بعض حضرات نے ہمہ قسم کے راویوں کے حالات بیان کیے۔ جیسے طبقات ابن سعد۔بعض حضرات نے صرف ثقہ راویوں کے حالات اپنی کتاب میں جمع کئے۔مثالاً ابن حبان کی کتاب الثقات۔ بعض حضرات نے صرف ایک شہر کے راویوں کے حالات جمع کیے اوران پر بحث کی۔جیسے خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد۔

بعض حضرات نے صرف ضعیف راویوں کے حالات جمع کئے، اوران کی روایات پر تنقید کی۔ان حضرات نے صرف وہ روایات نقل کیں جن کے باعث اس کے راوی کو نا قابل اعتبار قرار دیا گیا۔ یا اس پر تنقید کی گئی تھی۔اس قسم کی کتابیں بہت ہیں۔مثلا **الجرح و التعدیل لابن ابی حاتم۔ کتاب الضعفاء للعقیل۔ کتاب الضعفاء للبخاری، کتاب الضعفاء لابن حبان اورالکامل لابن عدی** وغیرہ ان کتابوں سے کسی روایت کونقل کرنا اور پھر دلیل میں پیش کرنا قوم کوصریح دھوکہ دہی ہے۔کیونکہ یہ مصنفین اپنی اس قسم کی کتابوں میں کوئی صحیح حدیث نقل نہیں کرتے۔ بلکہ ایسی روایت نقل کرتے ہیں جوان کے نزدیک، موضوع،منکراورضعیف ہوتی ہے۔وہیں اس روایت کو پیش کرکے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جوراوی ایسی نا قابل اعتبار اورمردودروایت نقل کرتا ہے۔وہ کیسے قابل قبول ہوسکتا ہےلہٰذااس راوی کی روایت قبول نہ کی جائے۔افسوس کہ آج اس قسم کی روایات کو مذہبی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔شب براءت کی جتنی روایات ہیں ان سب کوابن عدی نے نقل کرکے منکرقرار دیا ہے۔ذہبی کی میزان الاعتدال اسی کامل کا خلاصہ ہے۔جس کے حوالے ہم نے جگہ جگہ پیش کیے ہیں۔

ابن عدی اور ذہبی نے روایت عبدالملک کے حالات میں نقل کی اوراس روایت کومنکرقرار دیا۔اور لکھا کہ امام بخاری کہتے ہیں۔اس راوی کی روایات پراعتراض ہے۔ابن حبان کہتے ہیں یہ ایسی روایات بیان کرتا ہے۔جس کی تائید کوئی اورنہیں کرتا۔یعنی اس کی روایات خود ساختہ ہیں۔(میزان ج/۲، ص/۶۵۹)

اس روایت کے علاوہ اس عبدالملک کا ذکرکسی اورروایت میں کہیں نہیں ملتا۔جس سے یہ ثابت ہوتا

ہے کہ یہ شخص غیر معروف ہے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ جس دور میں یہ کتابیں تصنیف کی گئی اس دور میں ہر شخص کم وبیش روایت کی حیثیت سے واقف تھا۔ کیونکہ ایک ایک وقت میں ہزاروں ائمہ اور حافظ الحدیث موجود تھے۔ اوران کے لاکھوں شاگرد تھے بلکہ بعض آئمہ کے درس حدیث میں ستر ہزار کے قریب طالب علم موجود ہوتے۔ بعض حضرات کے یہاں تو آواز پہچانے کے لیے مکبر کھڑے کیے جاتے ہیں۔ اس لیے یہ محدثین کسی روایت پر تفصیلی بحث نہ کرتے۔ بلکہ اس کے ضعف کی جانب اشارہ کر کے آگے بڑھ جاتے کہ لوگ خود سمجھ لیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ حضرات ہمارے دور کے علماء کی طرح ضعف پرست بھی نہ تھے۔ اس لیے اشارہ بھی ان کے یہاں بڑی حیثیت رکھتا تھا۔ ابن عدی نے اپنی کتاب میں جب جب روایات کو منکر قرار دیا ہے ان میں سے ایک روایت بھی ایسی نہیں بعد کے کسی محدث نے صحیح کہا ہو۔ جو ان کے اس فن میں یکتا ہونے کی دلیل ہے۔ اسی طرح ابن عدی کی کتاب کا خلاصہ لکھنے والے امام ذہبی کا حال ہے کہ جس حدیث کو وہ صحیح کہہ دیں وہ یقیناً صحیح ہوتی ہے اور جسے وہ ضعیف کہہ دیں اس کی صحت کا دور تک بھی احتمال نہیں ہوتا۔ اور جس روایت کے بارے میں وہ کہہ دیں میں اسے نہیں جانتا وہ بازاری گپ ہے۔

فن رجال میں ابن عدی، ابو حاتم، ابو زرنہ، بخاری، نسائی، یحی بن سعید القطان، اور عبد الرحمن بن مہدی کا وہی مقام ہے جو فقر میں مالک شافعی اور ابو حنیفہ وغیرہ کا ہے۔ بعض اوقات یہ حضرات کسی روایت پر جرح مختلف مقامات پر کرتے ہیں مثلا اوپر حضرت موسیٰ اشعریؓ کی حدیث گزری ہے اس میں عبد اللہ بن لہیعہ، ضحاک بن ایمن، زید بن سلیم، ضحاک بن عبد الرحمان اور عبد الرحمن بن عرذب پر ہر ایک کے نام کے ساتھ علیحدہ جرح کی ہے۔ اس طرح اس روایت پر جرح پانچ مقامات پر ہوئی۔ یہ جرح یکجا موضوعات کی کتابوں میں ملتی ہے۔

ابن ابی عدی نے اس کی سند اس طرح بیان کی ہے۔ کہ مجھ سے یہ روایت عمرو بن الحارث نے بیان کی اس نے عبد الملک بن عبد الملک سے سنی۔ عبد الملک کا حال اوپر گزر چکا ہے۔ ان عمرو بن الحارث کے

بارے میں فرماتے ہیں یہ کوئی معروف شخص نہیں ۔اوراس سے اسحاق بن ابراہیم زہریق اوراس کی باندی علوہ کے علاوہ کوئی حدیث روایت نہیں کرتا۔ میزان ج ر ۳،ص ر ۲۵۱) گویا یہ راوی بھی قابل اعتماد نہیں۔

عبدالملک بن عبدالملک نے یہ روایت مصعب بن ابی ذئب سے نقل کی ہے۔ یہ کون حضرت ہیں مجھے ان کا حال آج تک معلوم نہیں ہوسکا، نہ عدی نے اس کا تذکرہ کیا۔ نہ ذہبی نے نہ بخاری نے، نہ نسائی نے اور نہ حافظ ابن حجر نے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس زمیں سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اس طرح یہ روایت انتہائی شدید ضعیف ہوئی۔

مصعب بن ابی ذئب نے یہ روایت قاسم بن محمد سے نقل کی ہے۔ قاسم مدینہ کے بہت بڑے امام، حضرت عائشہؓ کے بھتیجے اور حضرت ابوبکرؓ کے پوتے، جعفر بن محمد کے نانا اور باقر کے خسر ہیں۔ ان کی ذات شک وشبہ سے پاک ہے۔ لیکن یہ روایت ان کی جانب جو منسوب کی گئی ہے وہ غلط ہے۔ تینوں راویوں نے انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کا ثبوت جہاں تینوں راویوں کا نا قابل اعتبار ہونا ہے۔ وہاں ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ان راویوں کا دعویٰ ہے کہ قاسم نے یہ روایت اپنے والد محمد بن ابی بکر سے نقل کی۔ حالانکہ قاسم نے اپنے باپ کو دیکھا بھی نہیں۔ کیونکہ قاسم ۳۶ھ میں پیدا ہوئے اوران کا باپ محمد ۳۷ھ میں مارا گیا۔ کیا قاسم نے ایک سال کی عمر میں یہ روایت سن لی تھی؟

پھران راویوں نے یہ بھی بیان کیا کہ محمد بن ابی بکر نے یہ روایت اپنے والد سے نقل کی ہے۔ اول تو یہ محمد قطعاً اس قابل نہیں کہ اس کی روایت قبول کی جائے۔ اس لیے کہ یہ وہ ہستی ہے جس نے حضرت عثمان غنیؓ کے خلاف مصر میں زہر پھیلایا۔ پھر حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کیا اوران کی داڑھی پر ہاتھ ڈالا۔ اس کا شمار قاتلین عثمانؓ میں ہوتا ہے۔ ایسے شخص کی روایت کیسے قبول کی جاسکتی ہے؟ یہ تو تاریخ کی ایک بدنام ہستی ہے۔

رہا یہ دعویٰ کہ محمد نے اپنے والد سے یہ روایت سنی ہے یہ بھی بے پر کی گپ ہے۔ کیونکہ صحیح مسلم، سنن

ابی داؤد اور ابن ماجہ میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کا بیان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ۴ ر ذی الحجہ ۱۰ھ کو حج کے ارادے سے چلے۔ پہلی منزل ذوالحلیفہ ہیں ہوئی۔ وہاں پہنچ کر ابوبکرؓ کی بیوی اسماء بنت عمیس کے یہاں محمد نامی لڑکا پیدا ہوا۔ اور حضرت ابوبکرؓ کی وفات ۲۳ ر جمادی الثانی ۱۳ھ میں ہوئی۔ اس لحاظ سے جب ابوبکرؓ کی وفات ہوئی تو محمد کی عمر دو سال چھ ماہ اٹھارہ دن تھی۔ اس عمر میں حدیث سننا خلاف عقل ہے۔ اس قسم کی کہانیاں صوفیاء کے یہاں تو ضرور قبولیت حاصل کر سکتی ہیں لیکن محدثین وفقہا اور مؤرخین کے نزدیک اس کی حیثیت ایک سپید جھوٹ سے زیادہ نہ ہوگی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نام سے کھلا جھوٹ ہے۔

شعبان میرا مہینہ ہے

اس سلسلہ کی ایک بازاری روایت جو زبان زد عام ہے۔ اس کے الفاظ ہیں:

رجب شهر الله و شعبان شهری و رمضان شهر امتی

''رجب اللہ کا مہینہ، شعبان میرا مہینہ اور رمضان میری اُمت کا مہینہ ہے۔''

یہ ایک طویل روایت کا ابتدائی ٹکڑا ہے جو تقریباً دو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں رجب کے ایک دن کے روزوں کی فضلیت کا ذکر ہے اور اسی روایت میں صلاۃ الرغائب کا ذکر ہے۔ جو رجب کے پہلے جمعہ کی شب میں پڑھی جاتی ہے۔ اس روایت کے اگلے الفاظ ہیں:

لا تغفلوا عن اول جمعة من رجب فانها ليلة تسميها الملائكة الرغائب

''رجب کے پہلے جمعہ کی شب سے غافل نہ رہو کیونکہ یہ وہ رات ہے جس کا نام فرشتوں نے رغائب رکھا ہے۔''

ملا علی قاری حنفی نے ''موضوعات کبیر'' میں ابن جوزی نے اپنی ''الموضوعات'' میں ابن عبراق الکنانی نے ''التنزیه الشریعه فی أحادیث الموضوعة'' میں سخاوی نے ''المقاصد الحسنة''

میں جلال الدین سیوطی نے ''اللآلی المصنوعة فی أحادیث الموضوعه'' میں اور محمد طاہر پٹنی نے ''تذکرۃ الموضوعات'' میں اس کی وضاحت کی ہے کہ یہ روایت قطعاً من گھڑت ہے۔اس کی پوری سند میں کوئی راوی ایسا نہیں جس کا عالم دنیا میں کوئی وجود ہو۔اس کا واضع صوفی علی بن عبداللہ بن جہضم ہے۔جس کا انتقال ۴۱۰ھ میں ہوا۔ جو''بھجة الاسرار'' کا مصنف ہے۔ابن جوزی، ابن قیم، سیوطی، سخاوی، ابن عراق الکنانی، حافظ عراقی، مقدسی، جزری اور محمد طاہر پٹنی لکھتے ہیں کہ جتنی روایات بھی ماہ رجب یا اس کے روزوں کی فضیلت میں مروی ہیں سب موضوع ہیں ۔ (موضوعات کبیر ص ر ۱۶۴، اللالی المصنوعہ فی احادیث الموضوعہ ج ر ۱۰،ص ر ۵۶ ۔تذکرۃ الموضوعات ص ر ۴۴) سامام نووی صحیح مسلم کی شرح میں ایک حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔اللہ تعالیٰ اس روایت کے گھڑنے والے کو تباہ کرے ۔ائمہ فقہا و محدثین نے اس روایت کی تردید میں اتنی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جو حد و شمار سے باہر ہیں ۔(افسوس کہ وہ کتاب آج ہمیں دستیاب نہیں)

یہ تمام بحث امام نووی صحیح مسلم اور نسائی کی اس حدیث کے تحت کر رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ جمعہ کے دن کو روزوں کے لیے مخصوص نہ کرلو، اور نہ جمعہ کی رات کو کسی عبادت کے لیے مخصوص کرو اور یہ صلاۃ الرغائب رجب کے پہلے جمعہ کی رات کی شب میں پڑھی جاتی ہے۔

اسی طرح چلہ کشوں کے یہاں چلہ کشی اور مختلف عملوں کی ابتدا جمعہ کی شب سے ہوتی ہے۔اسی لیے اسے نوچندی جمعرات کہا جاتا ہے۔ یہ تمام طبقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے دشمن ہیں اور اسلام کے نام سے خرافات پھیلا رہے ہیں۔تبلیغی جماعت والوں کے یہاں بھی اجتماع جمعہ کی شب میں ہوتا ہے۔اسی لیے اہل کراچی اس شب مکی مسجد بھاگتے ہیں۔

اب تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس روایت کا گھڑنے والا علی بن عبداللہ بن جہضم ہے۔ جو ابن جہضم کی کنیت سے مشہور ہے۔ ذہبی اس کے حال میں لکھتے ہیں ۔اس کی کینت ابوالحسن ہے جو حرم مکہ کا مجاور تھا اور بعد کے صوفیاء کا شیخ تصور کیا جاتا ہے۔اس نے ''بہجۃ الاسرار'' نامی کتاب تصنیف کی۔اس پر

حدیثیں گھڑنے کا الزام ہے۔ابوخیرون کہتے ہیں محدثین نے اس پر اعتراضات کیے ہیں۔اور بعض محدثین کہتے ہیں یہ کذاب ہے اور اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ اس روایت اور اس نماز کا واضع یہی ہے۔(میزان ج/۲،ص/۱۴۲)

محدثین کے نزدیک ابن جہضم کذاب ہے اور دل سے روایات گھڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب منسوب کرتا ہے۔اس کی کتاب انہی خرافات کا مجموعہ ہے۔لیکن صوفیاء کے یہاں یہ کتاب سبقاً پڑھائی جاتی ہے۔ اور اس کے مطالعہ کی تلقین کی جاتی ہے۔پیران پیر اس کتاب کو سبقاً پڑھاتے تھے اور غنیۃ میں اس کی متعدد روایات بھی نقل کی گئی ہیں۔بعد میں صوفیاء نے جتنی کتابیں لکھیں سب نے اس کتاب سے استفادہ کیا۔احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت وغیرہ میں بھی اسی کتاب کی کرامات نظر آتی ہیں۔اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہر شر سے محفوظ رکھے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ ابن جہضم نے یہ روایت حمید بن انس کی جانب منسوب کی ہے اور کہتا ہے کہ حمید نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے۔حالانکہ حمید بن انس نامی نہ تو کوئی صحابی گزرا ہے نہیں کوئی تابعی۔باقی روایات شب براءت مجہول ہیں۔ممکن ہے کہ وہ بھی سب صوفی ہوں۔

بعینہ یہی روایت حضرت ابوسعید خدریؓ کی جانب بھی منسوب کی جاتی ہے۔لیکن اس کا ایک راوی کسائی ہے۔ابن جوزی،سیوطی،ابن عراق الکنانی اور محمد طاہر پٹنی اسے بھی موضوع قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسائی کذاب ہے اور اس میں واضح عیب یہ ہے کہ کسائی نے دعویٰ کیا ہے کہ ابوسعید خدریؓ سے اسے علقمہ نے روایت کیا ہے،حالانکہ امام علقمہ نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے کوئی حدیث روایت نہیں کی۔

ایک دعا

شیخ جیلانی نے اپنی کتاب ''غنیتہ الطالبین'' میں حضرت انسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب ماہ رجب شروع ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دعا فرماتے ہیں:

اللھم بارک لنا فی رجب و شعبان و بلغنا رمضان (غنیۃ الطالبین ترجمہ ج ۱، ص ۶۵۳)

''اے اللہ ہمارے لیے رجب وشعبان میں برکت فرما اور ہمیں رمضان تک پہنچا۔''

اس روایت کی تحقیق سے قبل حدیث کا ایک اصول ذہن نشین کر لیجئے۔ کہ اصول حدیث کی رو سے صرف وہی روایت قابل قبول ہوتی ہے جس کی مصنف نے پوری سند بیان کی ہو، یعنی اپنے دور سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور تک تمام راوی بیان کئے ہوں اور وہ سب ثقہ ہوں، ان کا حافظہ بھی قوی ہو اور ہر ایک کا دوسرے سے حدیث سننا بھی ثابت ہو۔ ان میں سے ہر راوی کو نہ تو مغالطہ ہوتا ہو، نہ اس میں وہم کا مادہ زیادہ ہو اور نہ ان میں سے کسی پر محدثین نے جرح کی ہو۔ یہ صحت کا پہلا معیار ہے جو روایت اس معیار پر پوری نہ اترے وہ اس قابل نہیں کہ اس کی جانب توجہ دی جائے۔ حتی کہ محدثین اس پر بھی متفق ہیں کہ اگر مسلمہ تابعی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان نقل کرے اور درمیان سے صحابی کا نام ترک کر دے جس سے اس نے یہ حدیث سنی ہے تو یہ روایت بھی قابل قبول نہیں، کیونکہ ممکن ہے کہ اس نے یہ حدیث صحابی سے نہ سنی ہے بلکہ جس سے سنی ہو وہ نا قابل اعتبار ہو۔ ایسی روایت جس میں صرف صحابی کا تذکرہ نہ ہو۔ محدثین کی اصطلاح میں مرسل کہلاتی ہے اور مرسل روایت قابل قبول نہیں۔ حتی کہ محدثین نے تصریح کی ہے کہ امام مجاہد، امام عطا بن ابی رباح، امام حسن بصری، امام زہری اور امام سفیان بن عینیہ کی مرسلات بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ حالانکہ یہ سب پہلی صدی میں پیدا ہوئے تھے اور ان میں سے اکثر نے اپنی آنکھوں سے صحابہؓ کو دیکھا ہے۔ ان کا عہد دور رسالت سے بہت قریب ہے۔ بلکہ آئمہ کسی صحابی سے حدیث روایت کریں جس سے ان کی ملاقات نہ ہوئی ہو تو وہ بھی قابل قبول نہیں۔ مثلاً حسن بصریؒ، حضرت علیؓ، عبداللہ بن عمرؓ، ابو ہریرۃؓ، جابر بن عبداللہؓ اور عبداللہ بن عباسؓ سے حدیث روایت کریں تو وہ قابل قبول نہیں۔ کیونکہ حسن نے ان سے ملاقات نہیں کی۔ یقیناً درمیان سے راوی چھوڑا گیا ہے۔ جب ایک راوی کے چھوٹ جانے سے روایت قابل قبول نہیں رہتی تو اُس روایت کا کیا درجہ ہوگا جس میں پورے پانچ سو سال کے راوی چھوڑ دیے جائیں، وہ تو بے پر کی گپ ہوگی۔

شیخ جیلانی نے اس روایت کی کوئی سند بیان نہیں کی اور پورے پانچ سوسال کے راوی چھوڑ دیے جو کم ازکم بارہ تیرہ ہونے چاہییں تھے۔ اس قسم کی روایت کے جھوٹ ہونے میں کیا شک وشبہ کیا جاسکتا ہے۔

امام مسلم نے صحیح المسلم کے مقدمہ میں امام یحی سعید القطان المتوفی ۱۹۸ھ کا قول نقل کیا ہے۔ کہ ہم نے ان نیک لوگوں سے زیادہ حدیث میں جھوٹا کسی کونہیں پایا۔ پھر امام مسلم اس کی اپنے الفاظ میں اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

لا یتعمدون الکذب بل یجری علی لسانھم۔ (مسلم ج ۱/ص ۱۴)

''یہ لوگ اگرچہ عمداً جھوٹ نہ بولتے تھے بلکہ لاعلمی کے باعث انکی زبانوں پر ہر وقت جھوٹ جاری رہتا۔''

گویا نیک، عابد، زاہد، متقی اور پرہیزگا ہونا اس بات کی دلیل ہے چونکہ اس کی تمام تر توجہ عبادت کی جانب مبذول ہوتی ہے اور علم حدیث سے شغف کم ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر سنی سنائی گپ کو حدیث تصور کر کے بیان کرنے لگتا ہے۔ اس طرح اس کی زبان پر ہمہ وقت جھوٹ جاری رہتا ہے۔ گویا زیادہ نیک ہونا اور لاعلمی میں جھوٹ بولنا لازم وملزوم ہیں۔

اسی قسم کا معاملہ غنیۃ الطالبین، منہاج العابدین اور احیاء العلوم وغیرہ میں نظر آتا ہے۔ بلکہ تصوف کی تمام کتابوں کا یہی حال ہے۔ اور اسلام سے جہالت کا اصل سبب اسی قسم کی کتابیں ہیں۔ جنہوں نے اسلام کی ہیئت ہی تبدیل کردی ہے۔

شیخ صاحب نے اس روایت کو ہبۃ اللہ السقطی سے نقل کیا ہے جس کا انتقال ۵۰۹ھ میں ہوا۔ اور وہ یہ روایت حضرت انسؓ سے نقل کررہا ہے جس کی وفات ۹۳ھ میں ہوئی۔ ان دونوں کے درمیان چارسوسولہ سال کا فاصلہ ہے۔ درمیان کے راوی کہاں گئے؟ ہمارے نزدیک یہ سب ہبۃ اللہ کھا گیا کیونکہ ہبۃ اللہ محدثین کے نزدیک کذاب ہے۔ حافظ ابن حجر ''**تبیین العجب بما ورد في رجب**'' اور ابن عراق الکنانی

''التنزیہ الشریعۃ فی احادیث الموضوعۃ'' میں فرماتے ہیں:

ھبۃ اللہ السقطی فھی الآفۃ۔ (التنزیہ الشریعہ ج/۱،ص/۱۶۰)

''ہبۃ اللہ السقطی تو ایک آفت ہے۔''

ابن ناصر کہتے ہیں:

لیس بثقۃ و ظھر کذبہ۔ (التنزیہ الشریعہ ج/۱،ص/۱۲۳)

''یہ ثقہ نہیں اس کا جھوٹ ظاہر ہو چکا ہے۔''

ذہبیؒ لکھتے ہیں اس ہبۃ اللہ کی کنیت ابوالبرکات ہے۔ اس نے حصول حدیث کے لیے اصبہان وغیرہ کا سفر کیا اور مختلف لوگوں سے روایت سنیں جنہیں اس نے اپنی کتاب ''المعجم'' میں جمع کیا۔ ابن السمعانی لکھتے ہیں کہ اس نے اس کتاب میں بہت سی روایات کے بارے میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے یہ روایات ابومحمد الجوہری سے سنیں اور انہیں پڑھ کر سنائی۔

ابن السمعانی کہتے ہیں یہ قطعا محال ہے۔ کیونکہ ہبۃ اللہ کی اتنی عمر نہیں ہوئی کہ وہ ان سے ملاقات کر سکتا۔ (میزان ج/۴،ص/۲۹۲)

حافظ ابومحمد الجوہری کا انتقال ۲۴۷ھ میں ہوا۔ ہبۃ اللہ ان سے حدیث اسی وقت سن سکتا تھا جب اس کی عمر تین سو سال کے قریب ہوتی۔ اس کا حال رتن ہندی کی طرح ہے۔ جس نے آٹھویں صدی میں یہ دعویٰ کیا کہ میں نے حضرت انسؓ سے احادیث سنی ہیں۔ دراصل ان صوفیاء نے احادیث رسول کو جھوٹوں کا اکھاڑہ بنالیا ہے، کہ کون زیادہ جھوٹ بولتا ہے۔ یہ بھی اللہ کا ایک شکر ہے کہ اس ہبۃ اللہ کی کتاب آج دنیا سے ناپید ہے ورنہ مزید دردسری پیدا ہوتی۔ اگرچہ شیخ صاحب نے شاگردی کا حق ادا کرتے ہوئے اسکے مختلف ہذیانیات کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ غنیۃ کا ایک تہائی حصہ اسی ہبۃ اللہ کی کرم فرمائی کا نتیجہ ہے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔

حضرت انسؓ کی ایک روایت

شیخ عبدالقادر جیلانی نے غنیۃ الطالبین میں حضرت انسؓ کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ روایت نقل کی ہے:

فضل رجب علی سائر الشھر و کفضل القرآن علی سائر الکلام و فضل شعبان علی سائر الشھور لفضلی علی سائر الانبیاء و فضل رمضان علی سائر الشھور کفضل اللہ علی سائر الخلق (غنیۃ ج/۱۔ص/۶۸۰)

''رجب تو تمام مہینوں پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسے قرآن کو تمام کلاموں پر، شعبان کو تمام مہینوں پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسے مجھے تمام انبیاء پر اور رمضان کو تمام مہینوں پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسے اللہ کو تمام مخلوق پر۔''

ملا علی قاری حنفی المتوفی سن ۱۱۴ھ اور علامہ عبدالرحمن بن علی الشیبانی فی الاثری اپنی اپنی کتابوں میں تحریر فرماتے ہیں:

قال ابن حجر انہ موضوع (موضوعات کبیر ص/۸۵)

''حافظ ابن حجر فرماتے ہیں یہ موضوع ہے۔''

(تمیز الطیب من الخبیث فی مایدر علی السنتہ الناس من الحدیث ص/۱۱۳)

امام سخاوی المتوفی ۹۰۲ھ اپنی کتاب ''المقاصد الحسنہ فی بیان کثیر من الاحدیث المشتہرہ علی الالسنۃ'' میں فرماتے ہیں:

قال شیخنا انہ موضوع (المقاصد الحسنہ ص/۲۹۹)

''ہمارے استاد کہتے تھے یہ موضوع ہے۔''

شیخ عبدالقادر جیلانی نے اس روایت کو بھی اسی ہبۃ اللہ الکذاب سے نقل کیا ہے۔

یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ ۵۱۱ھ تک تاریخ میں ہبۃ اللہ نامی پانچ اشخاص گزرے ہیں، اوران میں سے ایک بھی ایسا شخص نہیں جو قابل اعتماد ہو۔ ایک ہبۃ اللہ بن الحسن بن مظفر ہے۔ اس کے بارے میں ابن نقطہ کہتے ہیں یہ بلحاظ دین بدترین انسان تھا۔ ایک ہبۃ اللہ بن شریک الحاسب ہے۔ ابن السمعانی کہتے ہیں اس کے برے ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ ایک ہبۃ اللہ بن مزنی الموصلی ہے۔ یہ مجہول شخص ہے۔ ایک ہبۃ اللہ بن المبارک الدوانی یہ کٹر رافضی اور معتزلی تھا۔ اس کا انتقال ۵۱۱ھ میں ہوا۔ اور ایک ہبۃ اللہ بن المبارک السقطی ہے۔ جس کی روایات غنیّۃ میں پائی جاتی ہیں اور یہ کذاب ہے۔ اس کا انتقال ۵۰۹ھ میں ہے۔

شب براءت کا روزہ

لوگوں میں پندرہ شعبان کا روزہ رکھا جاتا ہے۔ جسے شب براءت کا روزہ کہتے ہیں۔ حالانکہ شب کے معنی رات کے ہیں اور روزہ دن میں رکھا جاتا ہے یہ ایسی ہی حماقت ہے جیسے پنج شنبہ کو جمعرات کہتے ہیں، حالانکہ وہ دن کا نام ہے، یا جیسے پیر پیران کو پیران پیر بولتے ہیں۔ لوگوں میں ایسی حماقتیں عام ہیں۔

اس روزے سے متعلق ایک روایت ابن ماجہ اور ابن حبان میں حضرت علیؓ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> ''جب نصف شعبان ہو، تو قیام کرو اور دن میں روزہ رکھو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس شب میں غروب آفتاب کے وقت آسمان دنیا پر نزول فرما ہوتا ہے۔ اور فرماتا ہے، ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ میں اس کی مغفرت کردوں۔ ہے کوئی رزق طلب کرنے والا کہ میں اسے رزق دوں، ہے کوئی مبتلائے مصیبت کہ میں اسے عافیت دوں، اسی طرح صبح صادق تک ہوتا رہتا ہے۔''

اس روایت کا ایک راوی ابوبکر بن عبداللہ بن ابی سیرۃ المدنی ہے۔ جو از حد نا قابل اعتبار ہے۔ حافظ ابن حجر تقریب التہذیب میں لکھتے ہیں۔ محدثین نے اسے واضع حدیث قرار دیا ہے۔ (تقریب التہذیب

ص/۳۹۶) نسائی لکھتے ہیں یہ متروک الحدیث ہے۔ (کتاب الضعفاء للنسائی ص/۱۱۵) بخاری کہتے ہیں ضعیف ہے۔ (کتاب الضعفاء للبخاری ص/۱۲۴)

ابن عدی کامل میں اور ذہبی میزان الاعتدال میں فرماتے ہیں یہ روایت منکر ہے۔ امام احمد کا قول ہے کہ یہ ابوبکر بن عبداللہ احادیث گھڑا کرتا تھا۔ یحیٰ بن معین کہتے ہیں یہ کچھ نہیں۔ یہ شخص پہلے شیعہ تھا۔ نفس ذکیہ کے ساتھ مل کر اس نے خلیفہ منصور کے خلاف بغاوت کی۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد یہ قید کر دیا گیا۔ تقریباً چھ ماہ بعد مدینہ کے کچھ غلاموں نے قید خانے پر حملہ کر کے قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ جس میں یہ بھی آزاد ہوا۔ آزاد ہوتے ہی مسجد کے منبر پر چڑھ گیا اور خلیفہ منصور کی تعریف میں فرضی روایات سنانی شروع کر دیں۔ جس پر منصور نے خوش ہو کر اسے قاضی بنا دیا۔ (میزان الاعتدال ج/۴، ص/۵۰۳)

علامہ ابوالحسن سندھی اپنی ابن ماجہ میں اور الھیثمی مجمع الزوئد میں لکھتے ہیں کہ امام احمد اور امام یحیٰ بن معین فرماتے ہیں یہ احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ اس لیے حدیث موضوع ہے۔ ابن جوزی نے بھی اسے موضوع قرار دیا ہے اور یہ روایت ابن ماجہ کی موضوعات میں شمار ہوتی ہیں۔

اس ابن ابی سبرۃ سے روایت نقل کرنے والا عبدالرزاق بن ہمام ہے۔ اگرچہ یہ حدیث کا امام تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ رافضی ہے۔ اور آخر عمر میں اس کے دماغ نے جواب دے دیا تھا۔ جس کی وجہ سے روایات میں غلط روایات شامل ہو گئیں۔ امام احمد فرماتے ہیں اسے سنی سنائی گپ زیادہ پسند تھیں۔ (میزان ج/۲، ص/۶۰۸)

ان روایات میں جس نزول الٰہی کا بار بار ذکر ہو رہا ہے۔ وہ کسی رات کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ یہ نزول ہر رات تہجد کے وقت ہوتا ہے۔ ان صوفیاء نے اسے ایک رات کے ساتھ مخصوص کر کے لوگوں کو تہجد کی نعمت سے محروم کر دیا اور اس طرح اسلام کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچایا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ینزل ربنا تبارک و تعالی کل لیلۃ الی السماء الدنیا عین یبقی ثلث اللیل الاخر

یقول من یدعو نی فاستجیب له من یسالنی فاعطیه من یستغفر نی فاغفر له

(بخاری ج/۱ص/ ۱۵۳اور مسلم ج/۱ص/ ۶۵۸اور ابن ماجہ ترجمہ ج/۱ص/ ۴۰۴)

''ہمارا پروردگا تبارک وتعالی ہر رات آسمان دنیا کی جانب نزول فرماتا ہے۔جبکہ تہائی رات باقی رہ جاتی ہے اور فرماتا ہے کون ہے جو پکارے کہ میں اس کی دعا قبول کروں،کون ہے جو استغفار کرے کہ میں اس کی مغفرت کروں۔''

یہ حدیث اکثر کتب احادیث میں متعدد سندات سے مروی ہے اور اس کی صحت میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔صوفیاء نے موضوع روایات پھیلا کر عوام کو تمام سال کی عبادت سے محروم کر دیا،اور عوام اس ایک رات پر بھروسہ کر کے بیٹھ گئے۔حالانکہ اگر پابندی سے تہجد کی نماز ادا کی جائے تو یہ رات خود بخود اس میں داخل ہو جائے گی۔

دنیا جانتی ہے کہ لیلۃ القدر رمضان میں ہوتی ہے۔اور اکثر صحابہ اور آئمہ کا اس پر اتفاق ہے۔لیکن جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

انها تدور فی السنة کلها

''وہ تمام سال میں گھومتی رہتی ہے''

اور جب حضرت ابی بن کعبؓ سے ان کے قول کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا۔ عبداللہ نے یہ بات اس لیے کہی تا کہ لوگ اس پر بھروسہ کر کے نہیں بیٹھ جائیں۔اسی لیے امام ابوحنیفہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ شب قدر تمام سال گھومتی رہتی ہے۔احادیث صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شب قدر آخر عشرہ میں ہوتی ہے۔اسی لیے ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

التمسوها فی العشر الاواخر فی رمضان (مسلم ج/۱ ص/ ۳۶۹)

''رمضان کے آخر عشرے میں اسے تلاش کرو۔''

لیکن افسوس کہ حنفیت کے دعویداروں نے شب قدر کو ستائیس کے ساتھ مخصوص کر کے رمضان کی

راتوں کی شب بیداری سے نجات حاصل کر لی۔اس قسم کے افراد جہاں شریعت کی روح کو فنا کر رہے ہیں وہاں امام ابوحنیفہ کو بھی بدنام کر رہے ہیں۔ یہ سب امام صاحب کے نادان دوست ہیں۔اور شریعت اسلامیہ کی بدنامی کا سبب ہیں۔ یہ چند روایات ہیں جو ہم نے بطور نمونہ پیش کی ہیں۔اگر ہم تمام روایت پیش کر کے اس پر بحث کریں تو ایک تفصیلی کتاب درکار ہوگی۔ ہم نے ہر روایات پر تفصیلی بحث اپنی کتاب ''شب براءت اور اس کی حقیقت'' میں بیان کی ہے۔ جسے دیگر روایات کی تحقیق مطلوب ہو وہ اس کتاب کا انتظار کرے۔

محدثین اور فقہاء کے تبصرے

آخر میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آئمہ، محدثین وفقہاء نے شب براءت اور اس کی روایت کے سلسلے میں جو آراء پیش کی ہیں، اور ان روایات پر جو تبصرے کئے ہیں وہ قارئین کی خدمت میں پیش کر دیں، تا کہ قارئین کو یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ کوئی ہماری نرالی رائے نہیں۔اگر چہ گزشتہ روایات کے تحت بہت سے محدثین کے اقوال آپ کی نظر سے گزر چکے ہوں گے۔لیکن تاہم ہم ذیل میں چند تفصیلی تبصرے پیش کرتے ہیں۔

علامہ محمد طاہر بن علی الحنفی الپٹنی المتوفی ۹۸٦ھ اپنی مایہ ناز کتاب ''تذکرۃ الموضوعات'' میں رقم طراز ہیں:

فی مختصر حدیث صلاۃ نصف شعبان باطل ولا بن حبان (وابن ماجه) من حدیث علی اذا کان لیلة الینصف من شعبان فقوموا لیلها و صوموا نهاراها ضعیف (و عند احمد بن حنبل و ابن معین وابن الجوزی موضوع و عند ابن عدی والذهبی منکر) و فی اللالی مائة رکعة فی نصفه بالاخلاص عشر مرات مع طول فضله للدیلمی وغیره موضوع و جمهور روانه من الطوف الثلاثة

جُاهيل و ضعيفاء و الحديث محال و ثنتا عشرة ركعة فيها كل ركعة بالاخلاص ثلاثين مرة موضوع و اربع عشرة ركعة فيها موضوع و فى الذيل حديث ابى بن كعب ان جبريل اتا فى ليلة النصف من شعبان قال ثم فصل الى ان قال تفتح فيها ابواب السماء و ابواب الرحمة ثلاثا مئة باب الى الصبح فيغفر لجميع من لا يشرک بالله او غير مشاحن او عاشر او محدثين من خمر او مصر على الزنا الى ان قال فخرج رسول الله ﷺ الى بقيع و سجد و تعوذ الخ يبين حاله و اصل الحديث بلاطول للترمذى ، و فى بعض الرسائل قال على بن ابراهيم و مما احدث فى ليلة النصف الصلاة الالفية مائة ركعةبالا خلاص عشراً عشراً بالجماعة واهتموا بها اكثر من الجمع و الا عياد و لم يات بها خبرو لا اثر الا ضعيف او موضوع و لا بغتر بذكره صاحب القوت والاحياء وغيرهما (اى غنيته الطالبين) و لا بذكر الثعلبى انها ليلة القدر و كان للعوام بهذه الصلاة افتنان عظيم حتى التزم بميها كثرة الرترد و ترتيب عليها من النسوق و انتها المحام ما بغنى عن و صفه حتى خشى الا ولياء من الخسف و هر بدا فيها الى المبوار مى واول حددث هذه الصلوة ببيت المقدس مسندة شان واربعين و اربع مائةو قال زيدبن اسلم (المتوفى١٣٦ھ) او ركنا احدمن مشائخنا و فقهائنا لميتفتون الى اللية البراءة و فضلها على غيرها وقال ابن دهية احاديث صلوة البراة موضوعةو واحد مقطوع (اى رواية الترمذى) و من عمل بخبو صح انه كذب فهو من خدم الشطان

قال على بن ابراهيم و قدراينا كثيرا ممن ليصلى هذه الصلوة فى الليلة القصيرة فيوتهم الفجرو يصبحون كسالى قال و قد جعلها اتمة المساجد مع

صلاۃ الرغائب و نحوھا شب لجمع الحوام و طلب ریاسۃ۔ التقدم و ملا بذکرھا القصاص مجالسھم و کل عن الحق بمزل ۔ ثم انہ تعالٰی اقام ائمۃ الھدی فی سعی البطال الصلاۃ فتلاشی امرھا الی ان صادت تصلی بعا ولھوا و تکامل البطالھا فی البلاد فصربۃ و الشامیۃ فی اوائل سنی المائۃ الثامنۃ

و قد ضعف ابن العوبی حدیث عائشہ و عتقاء النار بعد و شعو غنم کلب۔ قال اعقر عبادہ حدیث عائشہ فی ذھابہ و ترول الرب لیلۃ النصف الی سماء الدنیا فیغفر لا کتر من عدد شعر غنم کلب اخرجہ الترمذی قال و فی الباب عن ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ و سمعت محمد الیضعف حدیث عائشہ قال الترمذی و فیہ انقطاعان (تذکرۃ الموضوعات ص/ ۴۵۔۴۶)

''مختصر میں ہے کہ نصف شعبان کی نمازوں کے بارے میں جتنی روایات ہیں سب باطل ہیں اور ابن حبان (اور ابن ماجہ) کی یہ روایت کہ جب نصف شعبان کی شب ہو تو رات میں قیام کرو اور دن میں روزہ رکھو۔ یہ ضعیف ہے (امام احمد بن حنبل، یحیٰ بن معین اور ابن جوزی کے نزدیک یہ موضوع ہے اور ابن عدی اور ذہبی کے نزدیک منکر ہے) لالی میں ہے نصف شعبان میں سو رکعت نماز، اور ہر رکعت میں دس بار سورۃ اخلاص والی روایت دیلمی نے نقل کی ہے جو موضوع ہے۔ اس کی تین سندات ہیں ۔ جن کے تمام راوی مجہول اور ضعیف ہیں اور حدیث محال ہے۔ اسی طرح بارہ رکعت والی نماز کہ ہر رکعت میں تیس بار قل ہو اللہ اور چودہ رکعت والی نماز سب موضوع ہیں۔

ذیل میں ہے کہ ابی بن کعبؓ کی یہ حدیث کہ نصف شعبان کی شب میں جبریل میرے پاس آئے اور کہا اٹھ نماز پڑھو کیونکہ اس رات میں آسمان اور رحمت کے تین سو دروازے کھولے جاتے ہیں، پھر ہر اس شخص کی مغفرت کی جاتی ہے جو اللہ کے ساتھ شرک

نہ کرتا ہو، نہ کینہ رکھتا ہو نہ عشر لیتا ہو، نہ عادی شرابی ہو، اور نہ زنا پر مصر ہو۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بقیع تشریف لے گئے اور وہاں جا کر سجدہ کیا۔ اس کا حال کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ بقیع جانے کی روایت مختصر طور پر ترمذی میں ہے۔ بعض رسائل میں ہے کہ علی بن ابراہیم کا قول ہے کہ نصف شعبان کی رات میں یہ بدعت ایجاد کی گئی کہ سو رکعت نماز پڑھی جاتی۔ ہر رکعت میں دس بار سورہ اخلاص پڑھی جاتی ہے اور یہ نماز جماعت سے پڑھتے ہیں اور اس کا اہتمام عید اور جمعہ سے زیادہ کرتے ہیں۔ اس سلسہ میں کوئی حدیث صحیح یا کسی صحابی و تابعی کا کوئی قول مروی نہیں۔ قوت القلوب اور احیاء العلوم کے مصنفین نے جو روایات نقل کی ہیں ان سے دھوکہ نہ کھانا۔ اسی طرح ثعلبی نے جو تفسیر میں لکھا ہے کہ یہی لیلۃ القدر ہے۔ اس سے دھوکہ نہ کھانا۔ ان نمازوں کے ذریعہ عوام بہت بڑے فتنوں میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اسی وجہ سے کثرت سے چراغاں کیا جاتا ہے اور بھی متعدد فسق و فجور اور ترک فرمات کئے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اللہ کے نیک بندے اس خوف سے کہ زمین میں نہ دھنسا دیے جائیں اس رات شہر چھوڑ کر جنگلوں کو چلے جاتے۔ سب سے پہلے یہ نماز بیت المقدس میں ۴۴۸ھ میں جاری کی گئی۔ زید بن اسلم المتوفی ۱۳۶ھ کہتے ہیں ہم نے اپنے اساتذہ اور اپنے دور کے فقہاء میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ لیلۃ البراءت کی جانب کوئی توجہ دیتے یا اسے دیگر روایتوں پر فضیلت دیتے ہیں۔ اور ابن دحیہ کہتے ہیں شب براءت کی نمازوں کے بارے میں جتنی روایات ہیں سب موضوع ہیں۔ ان میں سے ترمذی والی روایت منقطع ہے۔ اور جو شخص ان روایات کو صحیح سمجھ کر ان پر عمل کرے وہ جھوٹ بولتا ہے اور شیطان کا خادم ہے۔ علی بن ابراہیم کا بیان ہے کہ ہم نے بہت سے لوگوں کو یہ سو رکعت والی نماز چھوٹی راتوں میں پڑھتے دیکھا جس کے باعث صبح کی نماز جاتی رہتی ہے اور تمام دن سستی میں گزرتا ہے۔ دراصل مساجد کے اماموں نے صلوٰۃ الرغائب اور اس قسم کی نمازوں کو اپنا مجمع لگانے اور اپنی عزت

بڑھانے کا ایک جال بنا رکھا ہے۔اسی لیے قصہ گو ان روایات کا اپنی مجالس میں ذکر کرتے ہیں ۔اسی قسم کے تمام لوگ حق سے دور ہیں ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہدایت یافتہ امہ کو اس کی توفیق دی کہ انہوں نے اس قسم کی نمازوں کا باطل ہونا ثابت کیا۔ان کی حقیقت معلوم کی۔ حتی کہ ان کی حیثیت ایک کھیل کود کی رہ گئی۔ پھر آٹھویں صدی کی ابتدا میں مصر اور شام کے علاقوں سے ان کا کلی خاتمہ ہو گیا۔

ابن العربی نے حضرت عائشہؓ کی حدیث کو ضعیف قرار دیا جس میں بنو کلب کی بھیڑوں کے بالوں کے برابر لوگوں کو دوزخ سے آزاد کرنے کا ذکر ہے، یہ حقیر بندہ (محمد طاہر پٹنی) کہتا ہے عائشہؓ کی حدیث جس میں بقیع جانے ،اللہ کے آسمان دنیا پر نازل ہونے اور پھر بنو کلب کی بھیڑوں کے بال اتنے لوگوں کی مغفرت کا ذکر ہے۔اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور خود کہا ہے کہ اس مضمون کی ایک روایت ابوبکر سے بھی مروی ہے۔اور میں نے محمد اسمعیل بخاری سے سنا کہ وہ اس روایت کو ضعیف کہتے تھے۔ پھر ترمذی کہتے ہیں یہ روایت دو جگہ سے منقطع ہے۔''

ملا علی قاری حنفی نے امام ابن القیمؒ کا ایک مضمون نقل کیا ہے،جس میں امام مذکور نے موضوعات پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بیان فرمایا ہے کہ کس کس قسم کی روایات موضوع ہیں۔وہ فرماتے ہیں:

و منها احاديث صلوات الايام و الليالى (كما فى الغنية) كصلاة يوم الاحد و ليلة الاحد و يوم الاثنين وليلة الاثنين الى اخر الاسبوع كل احاديثها كذب و امثلها مارواه عبد الرحمن بن سندة و هو صدوق عن ابن جهضم و هو واضع الحديث حدثنا على بن محمد بن سعيد البصرى حدثنا ابى حدثنا خلف بن عبد الله الضغانى عن حميد بن انس پرفعه رجب شهر الله و شعبان شهرى و رمضان شهر امتى الحديث و فيه لا تفعلوا عن اول جمعة من رجب فانها ليلة تسميها

الملا ئكة الرغائب و ذكر الحديث بطوله قال ابن الجوزى اقهموا به ابن جهضم قا ل و سمست عبد الوهاب الحافظ يقول مجهولون فتشتت عليهم جميع الكتب فما وجدتهم قال بعض الخاظ بل لعلهم لم يخلفوا (موضوعات کبیر ص/ ١٦٢)

''ان موضوع روایات میں سے ہر دن اور ہر رات کی نمازیں بھی ہیں۔ جیسے اتوار کی نماز، اتوار کی شب کی نماز، پیر کی شب کی نماز، اسی طرح پورے ہفتہ کی نمازیں۔ اسی طرح وہ روایت بھی موضوع ہے جسے ابن مندہ نے روایت کیا ہے جو خود تو سچے تھے، ابن جہضم سے جو احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ اس نے علی بن محمد بن سعید البصر ی سے اس نے اپنے باپ محمد سے اس نے خلف بن عبد اللہ الصغانی سے اس نے حمید بن انس سے۔ اس نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہ رجب اللہ کا مہینہ، شعبان میرا مہینہ اور رمضان میری اُمت کا مہینہ ہے۔ طویل حدیث ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ رجب کے پہلے جمعہ کی شب سے غافل نہ رہو، کیونکہ فرشتوں نے اس رات کا نام رغائب رکھا ہے پھر راوی نے ایک طویل حدیث بیان کی۔ ابن جوزی کہتے ہیں۔ محدثین کا قول ہے کہ یہ روایت ابن جہضم نے وضع کی ہے۔ میں نے حافظ عبد الوہاب سے سنا وہ فرماتے تھے میں نے تمام کتابیں چھان ماری لیکن مجھے ان راویوں کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ اسی لیے بعض حفاظ حدیث کہتے ہیں یہ راوی تو کبھی عالم وجود میں بھی نہ آئے تھے۔''

علامہ ابن القیم آگے چل کر فرماتے ہیں:

و من ذلک احادیث صلوۃ لیلۃ النصف من شعبان کحدیث یا علی من صلی لیلۃ النصف من شعبان مائۃ رکعۃ بالف قل ھو اللہ احد قضی اللہ لہ کل حاجۃ طا لبھا تلک اللیلۃ و ساق خرافات کثیرۃ۔۔۔۔۔

والعجب صحن شم رائمة العلم بالسنة ان يغتو بمثل هذه الهذيان و يصيلها و هذه الصلوة و ضعت فی الا سلام بعد الاربع و مائة و نشات من بيت المقدس فوضع لماعدة احاديث منها من قرأ ليلة النصف مرة قل هو الله احد الحديث و فيه بعث الله اليه سائة الف ملک يبشرونه و حديث من صلی ليلة النصف سن شعبان ثلث عشرة ركعة يقوأ فی كل ركعة ثلاثين قل هو الله احد شفع فی عشرة قد استوجبو النار وغير ذلكمن الاحاديث اللتی لا يصح منها شئی (موضوعات كبير ص/ ١٦٥)

''انہی موضوع روایات میں سے نصف شعبان کی رات کی نمازیں ہیں۔مثلاً یہ روایت کہ اے علی جس نے نصف شعبان کی شب میں سو رکعت نماز پڑھی، اور ہر رکعت میں دس بار قل ہو اللہ پڑھی اللہ تعالیٰ اس رات میں اس کی ہر حاجت پوری فرماتا ہے۔ پھر اس کے راوی نے اس روایت میں کافی بکواس بکی ہے۔''

تعجب تو ان لوگوں پر ہے جنہیں علم حدیث اور سنت کی کچھ خوشبو بھی پہنچی ہے کہ وہ اس قسم کے ہذیان سے دھوکا کھائیں اور یہ نماز پڑھیں۔ یہ نماز اسلام کے چار سو سال بعد بیت المقدس میں وضع کی گئی۔ پھر اس رات کی فضیلت میں متعدد روایات وضع کر لی گئیں۔ مثلاً جس نے نصف شعبان کی شب میں نماز کے دوران ایک ہزار بار قل ھو اللہ پڑھی۔ آگے ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے پاس ایک لاکھ فرشتے بھیجتا ہے جو اسے بشارت دیتے ہیں، اور یہ روایت جس نے نصف شعبان کی شب میں تیرہ رکعت نماز پڑھی اور ہر رکعت میں تیس بار قل ہو اللہ احد۔ تو ان دس آدمیوں کے بارے میں جن پر جہنم واجب ہو چکی، اس کی شفاعت قبول کی جاتی ہے۔ اسی قسم کی اور متعدد روایات ہیں جن میں سے ایک بھی صحیح نہیں۔''

ملا علی قاری نے امام محمد بن الجزری کا قول بھی نقل کیا ہے جو قرأت کے بہت بڑے امام اور حصن حصین کے مصنف ہیں۔ جن کی کتاب بطور وظیفہ پڑھی جاتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

و کذا صلاۃ عاشوراء و صلوۃ الرغائب موضوع بالاتفاق کذا لقیۃ صلوات لیالی رجب و لیلۃ السابع و العشرین من رجب و لیلۃ النصف من شعبان ماء رکعۃ فی کل رکعۃ دعشر مرات بالا خلاص و لا تغنو بذکرھا فی قوت القلوب و احیاء العلوم و لا بذکر الثعلبی فی تفسیرہ و کذا فی شرح الاوراد (موضوعات کبیر ص ۱۵۲)

''اسی طرح عاشورا کی نمازیں اور صلوۃ الرغائب بالاتفاق موضوع ہیں ۔ اسی طرح ماہ رجب کی ہر رات کی نمازیں اور ستائیسویں رجب کی نمازیں، اور نصف شعبان کی نمازیں اور یہ نماز کہ اس رات میں سو رکعت نماز پڑھو، اور ہر رکعت میں دس بار سورۃ اخلاص یہ سب موضوع ہیں ۔ یہ روایتیں قوت القلوب، احیاء العلوم، ثعلبی کی تفسیر اور شرح الاوراد میں یہ روایات نظر ہوتی ہیں ان سے دھوکہ نہ کھانا ۔'' (اسی طرح غنیۃ، بہار شریعت اور شاہ عبد القادر کی تفسیر کو دیکھ کر دھوکا نہ کھائے)

تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی میں ہے:

لم اجد فی صوم لیلۃ النصف من شعبان حدیثا مرفوعا صحیحا اما حدیث علی الذی رواہ ابن ماجۃ فقد عرفت التضعیف جداً (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۵۳)

''میں نے نصف شعبان کے روزے کے بارے میں کوئی حدیث صحیح مرفوع نہیں پائی اور علی کی وہ روایت جسے ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ وہ تو انتہا سے زیادہ ضعیف ہے۔''

علامہ شبیر احمد عثمانی فتح الملہم شرح مسلم میں امام عینی حنفی کا قول نقل کرتے ہیں۔

قال العینی و اما الا حادیث التی فی صلوۃ النصف من شعبان نذکر ابو الخطاب بن دحیۃ انھا موضوعۃ فتح الملھم (شرح مسلم ج ۳ ص ۱۷۴)

''علامہ عینی حنفی کہتے ہیں نصف شعبان کی نمازوں کے بارے میں جتنی احادیث ہیں، تو ابو

الخطاب بن دحیہ فرماتے ہیں یہ سب موضوع ہیں۔''

حاصل کلام یہ کہ شعبان اور شب تبرا سے متعلق جتنی روایات ہیں وہ سب موضوع، منکر یا شدید ضعیف ہیں۔ ان پر عمل کس صورت میں جائز نہیں۔ علی الخصوص ایسی صورت میں جب عوام نے انہیں لازمہ دین تصور کرلیا ہو۔ ان پر عمل قطعاً حرام ہے۔ اگر اس قسم کے امور کی اجازت دے دی جائے گی تو تحریف فی الدین کا دروازہ کھل جائے گا۔

یوسف کوکن عمری ''سیرت ابن تیمیہ'' میں لکھتے ہیں:

''شعبان کی پندرھویں شب کو شام وعراق کے باشندے صلوٰۃ الالفیہ ہزارہ نماز پڑھتے تھے۔ یہ سو رکعت کی نماز تھی۔ ہر دو رکعت پر سلام پھیرا جاتا اور ہر رکعت میں سورت فاتحہ کے بعد سورۂ اخلاص دس مرتبہ پڑھی جاتی تھی۔ بعض لوگ سو رکعت کے بجائے صرف دس رکعت پڑھتے اور ہر رکعت میں سورۂ اخلاص سو مرتبہ پڑھتے۔ غزالی نے احیاء العلوم میں (عبدالقادر نے غنیۃ الطالبین) جلد ۱، ص/ ۱۸۲ پر تحریر کیا ہے کہ لوگ نماز جماعت کے ساتھ پڑھا کرتے تھے اور اسے صلاۃ الخیر کہتے تھے۔ پھر حسن بصری سے یہ غلط (اور بلا سند) روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھ سے تیس سے زائد اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان کیا کہ جو کوئی یہ نماز پڑھے اللہ تعالیٰ اس کی طرف ستر مرتبہ نظر ڈالتا ہے اور ہر نظر میں اس کی ستر حاجات پوری کرتا ہے جن میں سے ایک ادنیٰ حاجت مغفرت الٰہیہ ہے۔'' (سیرت ابن تیمیہ ص/ ۱۳۳)

حسن بصری کے اس قول اور صلاۃ الخیر پر تفصیلی بحث ہم نے ''شب براءت اور اس کی حقیقت'' میں کی ہے۔ ہمیں تعجب تو اس پر ہے کہ غزالی فقہ شافعیہ کے امام مانے جاتے ہیں۔ حالانکہ شوافع کے نزدیک نفل باجماعت حرام ہے۔ دراصل مرض تصوّف نے ان کو عقل کا ماؤف کر دیا ہے۔

یہ بھی ایک حیرت ناک امر ہے کہ جو نمازیں ۴۴۸ھ میں جاری کی گئیں اور اُس دور کے اور بعد

کے علماء ان نمازوں کے خلاف صف آرا رہے اور بہت سی کتابیں اس کے رد میں لکھی گئیں، اور غزالی تقریباً اسی دور میں پیدا ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کا انتقال ۵۰۵ھ میں ہے انہوں نے علماء کا طریقہ چھوڑ کر ان جاہلوں کا طریقہ کیوں اختیار کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ تصوف کے علاوہ کچھ نہیں اور غزالی حدیث سے نابلد تھے اور تمام زندگی میں بخاری و مسلم کے علاوہ انہوں نے حدیث کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ کاش وہ ان ہی کتابوں کو اپنا معیار بنا لیتے۔

یہ بھی آپ سابقہ سطور میں علامہ طاہر پٹنی کی زبانی پڑھ چکے ہیں کہ جب یہ نمازیں جاری کی گئیں تو اللہ کے نیک بندے اس خوف سے شہر چھوڑ کر جنگل کو چلے گئے کہ اس بدعت کے باعث انہیں اللہ تعالیٰ زمین میں نہ دھنسا دے یہ ان کا خوف حقیقت بن کر سامنے آیا اور کچھ عرصہ بعد ہی عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کا وہ قتل عام کیا جو آج تک تاریخ میں یادگار ہے۔ حتیٰ کہ مسجد عمر میں گھٹنوں گھٹنوں مسلمانوں کا خون بہہ رہا تھا۔ یہ اللہ کا ایک عذاب تھا جو اسی رات کے باعث مسلمانوں پر نازل ہوا۔

کوکن عمری صاحب آگے لکھتے ہیں:

''ابو طالب مکی اور غزالی (عبدالقادر) کے لکھ دینے سے عام مسلمانوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ یہ نمازیں مستحب ہیں۔ اس بدعت کو سب سے پہلے ابن ابی الحمراء نے ۴۴۸ھ میں جاری کیا۔ یہ شخص نابلس کا رہنے والا تھا۔ اس نے اولاً یہ نماز تنہا پڑھنی شروع کی پھر دوسرے اس کی اقتدا کرنے لگے۔ ان راتوں میں ہر گھر میں حلوے مانڈے پکائے جاتے اور مساجد میں روشنی کا انتظام ہوتا۔ صحن مسجد اور اطراف میں بازار لگتا۔ ہر قسم کے لچے بدمعاش جمع ہوتے، خوانچے والے مسجدوں میں صدا لگاتے، اور سقے پانی لیے ہر طرف گھومتے۔ مرد اور بچوں کے ساتھ عورتیں زرق برق لباس پہن کر اور عطر لگا کر ان نمازوں میں شریک ہوتیں (یعنی اچھا خاصا مینا بازار لگتا۔ پھر حسن مجازی کے دلدادہ اس سے کیسے پیچھے رہتے، ورنہ عشق حقیقی کی منزل کیسے طے ہوتی) پندرھویں شعبان کو خاص طور پر عورتیں زیادہ آتیں

اورمزاروں پرحاضری دیتیں۔'' (سیرت ابن تیمیہ ص/ ۱۳۳)

کوکن صاحب نے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ تو کچھ نہیں بلکہ علامہ طاہر پٹنی ''تذکرہ الموضوعات'' میں یہاں تک لکھتے ہیں:

واعظم منه ما یوجد الیوم فی مسجد القصاص من اختلاط الرجال و النساء و متلاسق اجسارهم حتی یروی ان رجلا ضم امراة من خلفه و عبث بها و اخر التزم المراة وغیر ذلک من الفسوق و اللغط و السرنة و تنجیس مواضع العبادة و اهانة بیوت الله و کله بدعة قبیحة (تذکرة الموضوعات)

''سب سے بڑا فتنہ جوان قصہ گوملاؤں کی مساجد میں پایا جاتا ہے۔ وہ مرد وعورت کا اختلاط ہے۔ حتیٰ کہ ان کے جسم ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، حتیٰ کہ یہ بھی بیان کیا گیا کہ ایک شخص نے ایک عورت کو دبوچ لیا اور اس سے مسجد میں کھیلتا رہا دوسرے نے عورت کو اپنے سینہ سے چپٹا لیا۔ اسی قسم کے فسق و فجور، لغو باتیں، چوری، مساجد میں ناپاکی اور اللہ کے گھروں کی توہین۔ یہ سب بدعات قبیحہ ہیں جو اس رات انجام دی جاتی ہیں۔''

اس سے تاریخ کا ایک بدترین منظر سامنے آتا ہے۔ ممکن ہے کہ تمام علاقوں میں یہی صورت حال ہو اور ممکن ہے کہ یہ نقشہ ہندوستان کا بیان کیا جارہا ہو۔ کیونکہ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ علامہ طاہر پٹنی کو چالیس سال کی عمر میں بدعات کی مخالفت کے باعث ۹۸۲ھ میں شہید کردیا گیا۔ یہ اکبر کا دور تھا۔ بھلا غنڈے اور بدمعاش اس بات کو کیسے گوارا کرسکتے تھے کہ ان کی عیاشی کے ذرائع ختم کردیے جائیں۔ اس عبارت سے یہ بات سامنے آئی کہ دراصل اس رات کی عبادت اور قبرستان کے چکروں کی غرض وغایت کیا تھی۔ اس دور کا ملا تو بے وقوف ہے کہ وہ اسے خدا پرستی کا ذریعہ تصور کرنے لگا ورنہ حقیقت تو اس سے غرض صنم پرستی اور وصال یار تھا۔ ہمارے دور کے ملا تو مفت میں بدنام ہوگئے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم　　نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

ان امور کی بنیاد ابن ابی الحمراء اور ابن ابی جہضم جیسے صوفیا نے رکھی، اور ابو طالب مکی، غزالی اور جیلانی وغیرہ نے ان کی ترویج واشاعت کا کام انجام دیا۔ اگر چہ صدیوں تک علماء کی مخالفت کے باعث ان خرافات میں کمی تو ضرور واقع ہوئی۔ لیکن اصل شے علی حالہ باقی رہی۔ ہاں یہ اللہ کا فضل ضرور ہوا کہ ملک شام اور مصر سے اسے ہمیشہ کے لیے اخراج کا پروانہ مل گیا۔ ملک عرب کی سرزمین تو اس غلاظت سے ہمیشہ پاک رہی۔

پہلے دور میں اور موجودہ دور میں یہ فرق ضرور ہے کہ پہلے دور کے تمام علماے محدثین وفقہاء اس کھیل کے سخت دشمن تھے۔ لیکن موجودہ دور کے اور علی الخصوص ہندو پاکستان کے بیشتر علماء نے نہ صرف اس پر مہر جواز ثبت کی بلکہ اس کھیل میں خود بھی برابر کے شریک ہو گئے۔ اور کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اس کے جواز کے لیے آباء اور بزرگوں کے عمل کی شہادت بھی حاصل ہو گئی۔ لیکن علامہ طاہر پٹنی کی تحریر سے یہ بات ضرور واضح ہو گئی کہ اس رات کا اصل مقصود کیا تھا۔ اور اس کی بنیاد رکھنے والے کس درجہ کے خبیث تھے۔

کوکن عمری تحریر کرتے ہیں:

''ہر دور میں علماء نے ان بدعات کو بند کرنے کی کوشش کی مگر عوام کی عقیدت (دل چسپی) کچھ ایسی تھی کہ وہ بند ہو ہو کر پھر جاری ہو جاتی۔ امام تیمیہ نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے ان بدعتی نمازوں کو مسلمانوں سے ختم کرایا۔ (یعنی مصر وشام سے)''

کوکن صاحب مزید لکھتے ہیں:

''اس سے بھی زیادہ سخت اور بری وہ سبوعی (ہفتہ وار) اور حولی (سالانہ) نمازیں ہیں جن کی بنیاد ابو طالب مکی، ابو حامد غزالی اور عبد القادر جیسے عجمیوں نے رکھی ہے۔ (پاک وہند میں رضا احمد نے بہار شریعت میں یہی کام انجام دیا) اور ان کو سنت رسول بتایا ہے۔ جن میں صلوٰۃ الالفیہ ہزارہ نماز بھی ہے جو رجب وشعبان میں ادا کی جاتی ہے اور سات رجب ستائیس رجب، عاشورہ، یا عیدین کی شب میں پڑھی جاتی ہیں۔ یہ تمام نمازیں بدعت ہیں، اور اُن سے متعلق ساری حدیثیں اور روایتیں جھوٹی ہیں، جو کوفی اور عجمی اختراع سے زیادہ

نہیں۔ جوان نمازوں کو غیر مشروع جان کر بھی پڑھے وہ مشرک وکافر ہے (ص/ ۱۲۵)

یہ اختراعات یہیں پر ختم نہیں ہوئیں بلکہ ہندوستان کے صوفیاء نے صلوٰۃ غوثیہ، لکھی روزہ، کشف القبور، تصور شیخ اور فنافی الشیخ جیسی مشرکانہ بدعات کا بھی اضافہ کیا اور انہیں اسلام کا لبادہ پہنا دیا گیا، دین تصوف کا انہی خرافات پر دارومدار ہے۔ جس کے نتیجہ میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ دین تصوف اور دین اسلام دو متضاد امور ہیں۔ ویسے بھی صوفیاء اور ان کے یہاں شریعت اسلامیہ ہمیشہ ثانوی چیز رہی۔

شب براءت کے اصل بانی مبانی رافضی شیعہ تھے۔ جنہوں نے اس قسم کی روایات گھڑ کر عوام میں پھیلائیں اور صوفیاء نے ہراول دستہ کے طور پر ان کے لیے راہ ہموار کی عزیز احمد اپنی کتاب ''ارمغان عجم'' میں رقم طراز ہیں:

''شیعوں کی کتاب ''تحفۃ العوام'' میں اس شب کی بے پناہ فضیلتیں درج ہیں۔ اس ماہ کو رجب سے زیادہ بابرکت شمار کیا گیا ہے۔ خاص کر ۱۴، ۱۳ اور ۱۵ تاریخ کو، ۱۵ شعبان کے بارے میں تحفۃ العوام کا مصنف لکھتا ہے:

''شب پانزدہم (پندرھویں) شب بیداری کر کے کہ اول سے تا آخر شب حق تعالیٰ کی جانب سے ندا آتی ہے کہ ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ میں اسے بخشوں، ہے کوئی روزی طلب کرنے والا کہ میں اس کی روزی کشادہ کردوں اور غسل اس شب میں باعث تخصیف گناہاں ہے۔'' (ارمغان عجم ص/ ۱۲۳)

اس عبارت میں بعینہ وہی مضمون ہے جو ہم نے سطور بالا میں ابن ماجہ کے حوالہ سے حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے۔ جہاں ہم نے یہ ثابت کیا تھا کہ اس کے دو راوی رافضی ہیں۔ یعنی ابوبکر بن ابی بسرہ اور عبد الرزاق بن ہمام۔ ہاں اس عبادت میں غسل کا ضرور اضافہ ہے، اور لطف یہ ہے کہ صوفیاء نے بھی اس شب میں غسل مستحب قرار دیا ہے۔ عزیز صاحب ''تحفۃ العوام'' سے نقل کرتے ہیں۔ منجملہ اعمال اس شب کے زیارت امام حسین علیہ السلام کی ہے کہ پیغمبران وملائکہ اس شب خدا سے رخصت لے کر آنحضرت (حضرت

حسینؓ) کی زیارت کو آتے ہیں۔ پس خوشحال اس کا جوان بزرگوں سے مصافحہ کرے۔ یعنی اس شب میں کربلا، کراچی، میں نیٹی جیٹی پل اور دیگر مقامات پر دیگر جگہوں پر جانے والے (بلکہ قبرستان جانے والے) تمام اشخاص انبیاء اور ملائکہ سے مصافحہ کرتے ہیں۔ اس شب کی تقدیس کا اندازہ کیجیے کہ سب پیغمبر و ملائکہ کربلا جاتے ہیں اور حضرت حسینؓ سے مصافحہ کرتے ہیں۔ اگر آپ ان کی قبر کا نقشہ بنا کر زیارت حسین پڑھیں تو گویا آپ نے بھی سب سے مصافحہ کرلیا۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ بقول شیعہ حضرت حسینؓ کا سر کوفہ میں اور بقیہ دھڑ کربلا بلکہ نینوا میں دفن ہے۔ بلکہ شیعہ حضرت حسینؓ کو شہید نینوا کا خطاب دیتے ہیں۔ جو کربلا سے تقریباً چار سو میل آگے ہے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ حضرات سر اور چہرہ دیکھے بغیر واپس ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ انہیں دونوں جگہ حاضری دینی چاہیے تھی اور شاید عراق و ایران جنگ کا مقصود بھی یہی ہے کہ کوفہ و کربلا پر کسی طرح قبضہ کیا جائے۔ دراصل ہمارے سنی بھائیوں نے شیعوں کے ظاہری دانت دیکھے ہیں۔

اس سے زیادہ معیوب کیا شے ہوگی کہ نواسا نانا کی زیارت کو خود نہیں جاتا۔ بلکہ نانا کو کربلا بلواتا ہے۔ دراصل اسکا مقصود یہ ہے کہ کربلا کی روضۂ رسول پر اور حضرت حسینؓ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر فضیلت ثابت کی جائے۔ اس طرح انہوں نے اس عبادت میں تبرّاء یعنی براءت سے کام لیا۔ لیکن شیعوں کے اس تبرے کا جواب میرے پاس موجود ہے۔ وہ یہ کہ تحفۃ العوام کا مصنف یہ تو تسلیم کرتا ہے کہ انبیاء کی ارواح عالم بالا سے آتی ہیں اور کربلا جا کر حضرت حسینؓ کی زیارت کرتی ہیں تو گویا ان کے نزدیک حضرت حسینؓ کی روح آج تک کربلا میں مقید ہے۔ پھر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ انبیاء و ملائکہ حضرت حسینؓ کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اگر ہم یہ بلا دلیل قبول بھی کرلیں تو کربلا میں تو ابن زیاد کے ساتھی بھی دفن ہیں۔ اس صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ انبیاء اور ملائکہ کا مقصود ابن زیاد کے ساتھیوں کی زیارت ہو۔ ان کے پاس ہمارے اس دعوے کا کیا جواب ہے۔

یہاں یہ تحقیق بھی ضروری ہے کہ کربلا میں مشہد حسین کی بنیاد کب رکھی گئی۔ اگرچہ تاریخی لحاظ سے اس

کی صحیح تاریخ تو معلوم ہی نہیں ہوتی۔لیکن عقل یہ ضرور کہتی ہے کہ بنوُامیہ کے زوال تک اس کی بنیاد قطعانہ رکھی گئی ہوگی۔ان کی حکومت کا زوال سن ۱۳۲ھ میں ہوا۔اگراس کی بنیاد دوراموی میں رکھی گئی ہے تو پھر شیعوں پران کا یہ احسان عظیم ہے۔ ۱۳۲ھ سے دورعباسی شروع ہوا۔اگرچہ عباسیوں اورعلویوں نے مل کر بنوامیہ کے خلاف سازشیں تیار کی تھی،اورعجمیوں نے ان کا ساتھ دیا تھا،لیکن عباسیوں نے اقتدار پر قبضہ جمالیا۔اور ابومسلم خراسانی کوقتل کرکے اس عجمی سازش پر پانی پھیر دیا کہ علویوں کی حکومت قائم ہو،نفس ذکیہ کے خاتمہ سے عباسیوں کا اقتدار مضبوط ہوگیا۔لیکن ہارون الرشید کے دورتک علوی اقتدار کی قبضہ کی لگاتار کوششیں کرتے رہے۔ برامکہ بھی اندرون خانہ علویوں کا ساتھ دیتے رہے۔ جب برامکہ قتل ہوگئے تو ان کی تمام امیدیں مامون الرشید سے وابستہ ہوگئیں،جس کی ماں ایرانی تھی۔ ہارون کی وفات کے بعدان شیعوں اور ایرانیوں نے مامون کوامین سے ٹکرایا۔اور مامون کے نام سے ۱۹۸ھ میں خلافت پرقبضہ کرلیا۔مامون بھی ان کی ہمنوائی میں شیعہ اورمعتزلی بن گیا۔ مامون کے بعد معتصم باللہ،اوراس کے بعداس کا بیٹا واثق باللہ مامون کے نقش قدم پر چلتے رہے۔ یہ دورعلماءاسلام کے لیے بہت ابتلا کا دورتھا۔واثق باللہ کا انتقال ۲۳۲ھ میں ہوا۔غالباً مشہدحسین کی بنیاداسی دوران رکھی گئی۔کیونکہ تاریخ میں یہ وضاحت کے ساتھ موجود ہے کہ ۲۳۲ھ میں متوکل علی اللہ خلیفہ ہوا،تواس نے ۲۳۶ھ میں مشہدحسین اوراس کے قرب وجوار کے مکانات منہدم کراکے اس میں کھیتی کرائی،اورلوگوں کواس کی زیارت سے منع کردیا۔کیونکہ متوکل علی اللہ بدعات کا دشمن تھا۔(طبری ج/۱۲،ص/۱۴۰۷۔ تاریخ اسلام معین الدین ندوی ج/۳،ص/۲۵۲)

۳۲۲ھ میں بنو بویہ رافضی بغداد پر قابض ہوگئے اوران میں سے معزالدولہ نے ۳۵۱ھ میں مساجد کے دروازوں اورمحرابوں پر خلفائے ثلثہ اورامیر معاویہ وغیرہ پرلعنت لکھوائی۔جس سے عوام اور حکومت میں ایک چپقلش پیدا ہوئی۔آخرکار یہ لعنت بغیرنام کے تحریر کی گئی۔اورسنیوّں کواس فیصلے پرمجبور کیا کہ خطبۂ جمعہ میں حضورﷺ کی صرف ایک صاحبزادی کا تذکرہ ہو،عشرہ مبشرہ کا نام خطبہ سے خارج کیا جائے۔اس وقت تک سنی خلافت راشدہ میں صرف تین خلفاء کے قائل تھے۔انہیں مجبور کیا گیا کہ حضرت علیؓ

کو چوتھا خلیفہ مانا جائے۔ امیر معاویہ وغیرہ کا نام خطبہ سے خارج کیا جائے۔ معزالدولہ کے فیصلوں پر آج تک ہمارے آئمہ مساجد اپنے خطبوں میں عمل پیرا ہیں۔ اسی معزالدولہ نے عشرۂ محرم میں ماتم جاری کیا۔ اسی نے شب غدیر منانے کا حکم دیا اور اسی کے حکم سے مشہد حسین دوبارہ تعمیر ہوا۔

گویا مشہد حسین کی پہلی بنیاد بھی ڈیڑھ سو سال بعد فرضی طور پر رکھی گئی تھی۔ لیکن وہ ۲۳۶ھ میں زمین کے برابر کر دیا گیا۔ پھر تقریباً سوا سو سال بعد اس کی فرضی تعمیر کی گئی۔ حالانکہ تاریخی تحقیق سے حضرت حسین کربلا میں شہید نہیں ہوئے۔ بلکہ نینوا کی سرزمین میں شہید کئے گئے۔ اور ان کی شہادت دس محرم کے بجائے ۲۱ صفر کو ہوئی۔ جیسا کہ امام ابن سعد نے اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ اسی باعث آج تک شیعہ در پردہ انہیں شہید نینوا کا خطاب دیتے ہیں اور علوم نینوا کو یاد کرتے ہیں۔ ہم نے یہ تمام تفصیلات قارئین کی معلومات کے لیے پیش کی ہیں۔ تحفۃ العوام کا مصنف آگے چل کر اس راز سے پردہ اُٹھاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

''جملہ متذکرہ برکات اس شب کے صرف اس لیے ہیں کہ جناب صاحب امر علیہ السلام کی اس شب ولادت ہے۔ (ارمغان عجم ص/ ۱۲۴)''

صاحب الامر سے مراد شیعوں کے بارھویں امام ہیں۔ دنیا میں صرف انہی کا حکم چلتا ہے اسی لیے انہیں صاحب الامر کہا جاتا ہے۔ انہی کو امام مہدی، امام غائب کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہیں اور شیعوں کے نزدیک وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں اس لیے انہیں امام حاضر اور امام الزماں بھی کہا جاتا ہے۔ اس شب براءت کی تمام فضیلت صرف اس لیے ہے کہ رافضیوں کے فرضی بارھویں امام کی ولادت اس شب ہوئی تھی اور اسی لیے اس کی فضیلت میں روایات وضع کی گئیں اور چونکہ ان کے یہ امام بھی فرضی تھے۔ کیونکہ گیارھویں امام حسن عسکری کے کوئی اولاد نہ تھی انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ لیکن ان کی چار باندیاں تھیں اور چاروں ایرانی تھیں۔ یہ چاروں دو سال تک پیٹ پھلائے رہیں تا کہ حسن عسکری کی دولت پر قبضہ کیا جا سکے۔ ان میں سے ہر ایک حاملہ ہونے کی مدعی تھی۔ لیکن جب دو سال تک کوئی بچہ پیدا نہ ہوا تو

عدالت نے بوڑھی عورتوں کو بھیج کر اُنکے پیٹ دکھوائے۔ جو قطعاً بچے سے خالی تھے۔ عدالت نے حسن عسکری کی وراثت اولاد اور بیوی نہ ہونے کے باعث بھائی کو دیدی۔ بعد میں ایک فرضی امام وضع کرلیا گیا اور اسے مہدی قرار دیا گیا۔ جس طرح شیعوں کے بارھویں امام فرضی ہیں۔ اسی طرح اس شب کی روایات بھی فرضی ہیں۔

محمود الحسن صاحب خسرو جو لاکلاس ہائی کورٹ حیدرآباد دکن کے اعزازی لیکچر، اور مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کے لیکچرار رہے۔ اپنی کتاب ''قرآن مجید کا نزول اور وحی'' میں لکھتے ہیں:

''شب براءت میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مختصر یہ کہ قرآن مجید کے نزول کو ماہ شعبان خاص شعبان کی پندرھویں شب یعنی شب براءت سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے اور نہ اس مہینے اور اس کی رات میں قسمتوں اور تقدیروں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ شب قدر کی خصوصیتیں ہیں جو رمضان کی ایک خاص رات ہے۔ جیسا کہ اوپر ثابت ہو چکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شعبان کی پندرھویں رات یعنی شب براءت نہ کوئی فضیلت و عظمت کی رات ہے، اور نہ یہ عبادت و دعا کی شب ہے، واعظین اس رات کی تقریبات کے بارے میں جو حدیثیں بیان کرتے ہیں، ناقدین احادیث نے ان سب کو بادلائل رد کردیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روایاتیں حدیث کی صحیح اور مستند کتابوں میں جگہ نہیں پاسکیں۔''

(قرآن مجید کا نزول اور وحی ص/ ۱۳)

خسرو صاحب نے اس کے بعد امام ابن القیم اور ملا علی قاری کے وہ اقوال پیش کیے جو ہم ہدیۂ ناظرین کرچکے ہیں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

''مختصر یہ کہ شب براءت کسی حیثیت ولحاظ سے کوئی مقدس رات نہیں ہے۔ نہ اس رات میں قرآن کا نزول ہوا ہے۔ نہ اس رات اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر تشریف فرما ہوکر قبیلہ کلب کی بھیڑوں کے بالوں جتنے انسانوں کے گناہ معاف فرماتے ہیں۔ نہ اس رات رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بقیع کے قبرستان جانا ثابت ہے، نہ اس رات جاگنا اور خاص نمازیں اور وظیفے پڑھنا اور نہ پندرھویں کے دن روزہ رکھنا ہے کم درجہ کی کتابوں میں جو روایاتیں بیان ہوئی ہیں ان میں بعض موضوع (من گھڑت) اور بعض غیر صحیح ہیں، اسی لیے نقاد آئمہ حدیث نے انہیں مسترد کر دیا ہے۔ امام ابن العربی ملکی (المتوفی ۵۴۳ھ) نے اپنی تفسیر ''احکام القرآن'' جلد ۲، ص/ ۲۱۴ میں پندرھویں شعبان کی رات کی تمام حدیثوں کو غیر معتبر ٹھرایا ہے:

لیس فی لیلة النصف من شعبان حدیث یعول علیه لا فی فضلها و لا فی نسخ الاجال فیها فلا تلتفتو اا لیها (قران مجید کا نزول اور وحی۔ ص/ ۱۸)

''نصف شعبان کی شب کے بارے میں کوئی حدیث ایسی نہیں جس پر اعتماد کیا جا سکے۔ نہ اس شب کی فضیلت میں، اور نہ موت و زندگی لکھنے کے قرآن مجید کا نزول اور وحی بارے میں۔ ان روایتوں پر قطعاً توجہ نہ دو۔''

حاصل کلام یہ کہ اس قسم کی تمام روایات نا قابل اعتبار ہیں اور حدیث کی کسی صحیح کتاب میں ان کا وجود نہیں۔ بلکہ یہ شیعوں کی ایک یادگار ہے جو صوفیاء کے ذریعے سنّیوں میں پھیل گئی۔ متقدمین میں کوئی عالم نہ تھا۔ اور نہ بلاد عربیہ میں اس کا کوئی وجود ہے۔ یہ صرف عراق و ایران اور ایشیا کے علاقوں میں منائی جاتی ہے۔ یعنی جہاں جہاں تشیع کا زیادہ اثر رہا۔ ہندو پاکستان میں اس کی اشاعت کی وجہ بھی یہی ہے کہ عباسی دور کی ابتدا میں شیعہ اور قرامطہ بھاگ بھاگ کر ہندوستان آتے رہے۔ پھر سندھ و ملتان اور لاہور وغیرہ میں قرمطی حکومت قائم ہوئی جو بدترین قسم کے رافضی تھے۔ مغلیہ خاندان کے پیشتر افراد شیعہ رہے۔ حتیٰ کہ شیعوں کے خلاف شاہ ولی اللہ کو کتاب لکھنے پر سزا ملی۔ اور شاہ عبدالعزیز کو بھی اپنی تصنیف ''تحفہ اثنا عشریہ'' سے انکار کرنا پڑا۔ اودھ کی اکثر ریاستوں پر بھی شیعہ قابض تھے۔ حیدر آباد دکن بھی شیعہ ریاست رہی۔ اس طرح شیعوں کو اپنے مسلک کے پروپیگنڈے کا موقعہ ملا۔ اور سنیوں کی زبانوں پر تالے لگا دیے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین میں حدیث و قرآن کا کوئی درس نہ دیا جاتا تھا۔ تاریخ سے تو آج تک عربی

مدارس محروم ہیں۔لیکن اب چند سال سے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ تشیع کے یہ سیاہ بادل کچھ چھٹتے نظر آتے ہیں۔

آتش بازی یا کہ آتش پرستی

نماز روزہ تو بالذات ایک عبادت ہے۔ بشرطیکہ انہیں شریعت کے بیان کردہ اوقات میں انجام دیا جائے لیکن آتش بازی اور چراغاں کس قسم کی عبادت ہے۔شریعت اسلامیہ نے کس وقت اور کون سے موقع پر اس آتش بازی اور چراغاں کا حکم دیا ہے۔ بلکہ ہجرت مدینہ کے بعد جب نماز باجماعت کی ابتدا ہوئی تو لوگوں کو جمع ہونے میں بہت دقت پیش آتی صحابہ کی ایک مجلس میں اس پر غور وفکر ہوا کہ لوگوں کو کس طرح جمع کیا جائے۔بعض صحابہ نے رائے دی کہ آگ روشن کر دی جائے، تاکہ روشنی دیکھ کر سب جمع ہو جائیں۔لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس رائے کو اس لیے رد فرما دیا کہ یہ آتش پرستوں کا وطیرہ ہے۔اس لیے ارشاد ہوا:

لاتشھوا بالمجوس

''مجوس سے مشابہت نہ کرو۔''

مجوسی یعنی آتش پرست دو خداؤں کے وجود کے قائل ہیں ایک کو خدائے خیر اور ایک کو خدائے شر کہتے ہیں۔یعنی خیر کا خالق جدا اور شر کا خالق جدا۔خدائے خیر کو خدائے یزداں اور خدائے شر کو خدائے اہرمن کہتے ہیں۔دوسرے لفظوں میں خدائے رحمان اور خدائے شیطان بھی کہا جا سکتا ہے۔یہ لوگ آگ کو سرچشمہ خیر تصور کرتے ہیں۔اسی تخیل کو گئی نظر رکھ کر ایران کی سرزمین میں جگہ جگہ آتش کدے بنائے گئے اور ہزارہا سال آگ کی پوجا ہوتی رہی۔حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب عراق پر حملہ ہو تو آتش کدے ختم کر دیے گئے۔ لیکن وہ علاقے جو آج مملکت روس میں داخل ہیں، یعنی بخارا، سمرقند اور بدخشاں وغیرہ ان کی آگ بنو امیہ کے زمانے میں سرد ہوئی۔کہیں یہی تو وجہ نہیں کہ ایرانی خلفائے ثلثہ اور بنو امیہ سے نالاں ہیں۔

مجوسیوں کے یہاں ہر خوشی کے موقعہ پر آگ کا مظاہرہ کیا جاتا۔جو آج بھی ان میں نوروز کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں جو دیوالی منائی جاتی ہے۔وہ اسی آتش پرستی کی یادگار ہے۔بنو عباس نے

جب بنوامیہ سے اقتدار چھینا، اور خلافت پر قبضہ کیا تو انہوں نے ایرانیوں اور عجمیوں کا تعاون حاصل کیا۔ کیونکہ عرب بنوامیہ کے ساتھ تھے۔ جس کی وجہ سے بنوعباس کے دور میں کلیدی عہدے ایرانیوں اور مجوسیوں کے پاس رہے۔ بلکہ ان کے حرم میں ایرانی اور مجوسی عورتیں داخل ہوئیں اور حرم سرا کے ذریعے اقتدار میں دخل اندازی شروع کی۔ بنوامیہ کا خاتمہ دراصل عربوں کا خاتمہ تھا اور بنوعباس کی خلافت اندرون خانہ دراصل ایرانیوں کی حکومت تھی۔

ان مجوسیوں نے جہاں اسلام کا لبادہ اوڑھ کر عربوں کی قوت ختم کی، وہاں اسلام کو بدنام کرنے کے لیے ہزارہا قسم کی روایات اور بدعات جاری کیں، مسلمانوں میں یونان اور ہندومت فلسفہ پھیلایا اور فلسفہ کے نام سے اسلام میں ہزاروں شکوک پیدا کئے۔ جتنے بڑے بڑے فلاسفر گزرے مثلاً ابوعلی سینا اور ابن ابی الحدید وغیرہ یہ سب شیعہ اور عجمی تھے۔ تصوف کو پھیلانے والے بھی سب عجمی ہیں۔

ان مجوسی عہدہ داروں میں سب سے اہم کردار برامکہ نے ادا کیا۔ برامکہ، برمک کی جمع ہے، اور برمک آتش کدے کو روشن کرنے والے اور نگرانی کرنے والے کو کہتے ہی۔ یعنی مہا پجاری، مجوسیوں کے یہاں یہ سب سے بڑا مذہبی عہدہ تھا، اس کی حیثیت ایک پوپ کی تھی۔ ان کو منع بھی کہا جاتا تھا۔ جس سے پیر مغاں بنا، یعنی پوپ اعظم حافظ شیرازی کے کلام میں جو پیر مغاں اور مغ بچہ۔ ان کا تمام تصوف انہی دونوں قسم کے لونڈوں کے گرد گھومتا ہے۔ جب ایران کے آتش کدے بجھ گئے اور برامکہ اور پیر مغاں کے مذہبی عہدے ختم ہوگئے تو انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر حکومت اسلامیہ میں عہدے حاصل کر لیے۔ عہدوں کے حصول کے بعد پہلے تو اپنے محسن ہارون الرشید کو بدنام کیا۔ اس کے بارے میں ہزار ہا شراب نوشی اور عیاشیوں کی کہانیاں پھیلائیں۔ جس کی یادگار آج تک ''الف لیلیٰ'' کی صورت میں موجود ہے۔ پھر ہارون کی بہن عباسیہ کے خلاف زہر فشانی کی اور بیت المال پر قابض ہوگئے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس نے مساجد میں چراغاں کی بدعت جاری کی۔ تاکہ اس طرح وہ آگ کی پوجا کر سکیں۔

علامہ محمد طاہر پٹنی ''تذکرہ الموضوعات'' میں لکھتے ہیں:

قال علی بن ابراهیم و اول حدوث الوقعد من البرامکة و کانوا عبدة النار فلما اسلموا ادخلوا فی الاسلام ما یموهون به انه من سنن الدین و مقصودهم عبادة النیران و لم یات فی الشرع زیادة الوقود علی الحاجة فی موضع (تذکرۃ الموضوعات ص/ ۴۶)

''علی بن ابراہیم کہتے ہیں کہ سب سے پہلے چراغاں برامکہ نے جاری کیا۔ دراصل وہ پہلے آگ کے پجاری تھے۔ جب وہ اسلام لائے تو انہوں نے اس آگ کو اسلام میں داخل کر دیا۔ یہ دھوکہ دے کر کہ یہ روشنی بھی دین کی سنت ہے۔ حالانکہ ان کا مقصود آگ کی پوجا تھی اور شریعت میں ضرورت سے زیادہ روشنی کسی جگہ جائز نہیں۔''

شیخ ابراہیم جلی حنفی اپنی کتاب ''غنیۃ المستملی شرح منیۃ المصلی'' میں فرماتے ہیں۔

قیل اول حدوث الوقود من البرمکة و کانو اور عندة النار فلما اسلموا ادخلوا فی الاسلام مایموهون انه من سنن الدین و مقصودهم عبادة النیران حیث رکعوا و سجدوا مع المسلمین، و لم یات فی الشرع فالا ستحباب زیادة الوقود علی الحاجة فی موضع (تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی وج/ ۲، ص/ ۵۳)

''کہا جاتا ہے کہ چراغاں کی بدعت برامکہ نے جاری کی کیونکہ وہ آگ کے پجاری تھے جب وہ اسلام لائے تو یہ دھوکہ دے کر کہ وہ دین کی سنت ہے انہوں نے آتش پرستی کو اسلام میں داخل کر دیا۔ حالانکہ ان کا مقصود آگ کی پوجا تھی۔ جب وہ مسلمانوں کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرتے تو آگ کو رکوع اور سجدہ مقصود ہوتا۔ اور شریعت میں ضرورت سے زیادہ کسی جگہ روشنی جائز نہیں ہے۔

امام عینی حنفی اپنی شرح بخاری ''عمدۃ القاری'' میں اور علامہ شبیر احمد عثمانی ''فتح الملہم شرح مسلم'' میں فرماتے ہیں:

و اما الوقود فی تلک اللیلة نزعم ابن دعیة ان اول ما کان زمن یحی بن خالد بن

برمک انهم کانوا یموهون به علی الطام قال و لما اجتمعت بالملک الکامل و ذکرت ذلک له قطع و امر هذه البدعة المجوسیة من مائر اعمال بلا والمعومة

(فتح الملہم شرح مسلم ج ر ۳،ص ر ۱۷۴)

''جہاں تک اس رات چراغاں کا تعلق ہے تو ابن دحیہ کہتے ہیں کہ اس کی ابتدا یحیٰ بن خالد بن برمک کے زمانہ میں ہوئی۔ وہ کھانا کھلانے کا نام کر کے لوگوں کو دھوکہ دیتے۔ جب ملک الکامل کے ہاتھ میں حکومت آئی اور میں نے اس سے ذکر کیا تو اس نے اس مجوسی بدعت کو پورے مصر سے خارج کر دیا۔''

ملک الکامل کے دور میں علامہ ابن دحیہ کی کوشش میں جہاں ایرانیوں کا ہمیشہ سے اثر غالب رہا ہے، اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ جس کے نتیجے میں آتش پرستی کے ساتھ ساتھ آتش بازی بھی وجود میں آ گئی۔ اسی طرح وہ رحمت جو بقول ان کے اس رات میں نازل ہوتی ہے اسے خود اپنے ہاتھوں سے آگ لگانی شروع کر دی۔ اس کھیل نے ہزار ہا گھر پھونک دیے۔ یہ بے وقوف ہر سال کروڑ ہا کے سرمایہ کو آگ دکھا دیتے ہیں۔ بلکہ اب تو اسے اتنا ضروری تصور کیا جانے لگا کہ اس کے بغیر شب براءت کا تصور بھی ممکن نہیں۔ گویا شب براءت اور آتش پرستی باہم لازم وملزوم ہیں۔ جہاں تک چراغاں کا تعلق ہے۔ اس کی حیثیت صرف ایک کھیل کی نہیں۔ بلکہ عوام الناس اسے خوشی اور رضائے الٰہی کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ جو خالص مجوسی عقیدہ ہے جو عین کفر ہے اور اسے رضائے الٰہی کا ذریعہ تصور کرنے والا بلا شک وشبہ کافر ہے۔ اس مجوسہ یادگار کو رمضان المبارک میں ختم قرآن۔ ۲۷ ر رمضان، ۲۷ ر رجب، یوم ولادت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سرکاری خوشیوں کے موقعوں پر بھی تازہ کیا جاتا ہے۔ پھر جشن ولادت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موقعہ پر چراغاں کیا جاتا اور اسٹیج پر کھڑے ہو کر گایا جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے ایران کے آتش کدے بجھ گئے۔ لیکن افسوس صد افسوس ان دعویداران حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان آتش کدوں کو خود اپنے ہاتھوں روشن کرتے اور اس پر

پھولے نہیں سماتے۔اس طرح سال میں کئی کئی بار ہر گھر میں آتش کدوں کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان عجمیوں کو آتش کدوں کا بجھنا سخت ناگوار گزرا ہے۔اسی لیے انہوں نے اس کی مخالفت کو اپنا لازمہ حیات بنالیا ہے۔یہ آتش بازی اور چراغاں جہاں مجوسیت کی یادگار ہے وہاں اسراف بیجا اور مال کا ضیاع بھی ہے۔ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا۔ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ﴾(سورہ بنی اسرائیل ۲۶-۲۷)

''اور فضول (مال) نہ اڑا۔ بیشک فضول اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔''(ترجمہ احمد رضا)

یہ مال اور سرمایہ کی بربادی کیا اُس قوم کو زیب دیتی ہے جو زندگی کی ہر ضرورت میں ترقی یافتہ ممالک کی محتاج ہو، بلکہ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو ہماری قوم آتش پرستی، نذر و نیاز، عرس، تعزیہ داری، تیجوں، برسیوں، سالگرہ اور شادی کی رسومات پر جتنا سرمایہ برباد کرتی ہے۔اس سرمایہ سے ہر سال ملک میں بیسیوں کارخانے تیار ہو سکتے ہیں۔جو قوم دوسرں کی محتاج ہوتی ہے وہ اسی طرح گھر پھونک تماشہ دیکھا کرتی ہے۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

حاصل یہ کہ شب براءت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔نہ دور صحابہ و تابعین اور تبع تابعین میں اس کا کوئی وجود تھا اور نہ اُن مقامات پر آج تک کوئی وجود رہا ہے۔جہاں سے اسلام چل کر ہم تک پہنچا ہے۔ یعنی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ۔یہ تمام خرافات سرزمین عرب سے باہر ہی جنم لیتی ہیں۔

حلوے مانڈے

آپ حضرات اوپر پڑھ چکے ہیں کہ جب ابن ابی الحمراء نے ۴۴۸ھ میں بیت المقدس میں اس شب بیداری کی بدعت جاری کی تو اس وقت حلوے مانڈے بھی تیار کئے گئے، تاکہ مفت خور لوگ حلوے

کے نام سے اس بدعت میں تعاون کریں بعینہ اسی طرح جیسے میلادوں اور ختم قرآن کے موقعہ پر شیرینی تقسیم کی جاتی ہے اور شیرینی کا نام سُن کر ہزاروں مکھیاں بھنکنے لگتی ہیں۔ اسی لیے ملا حلوا خور مشہور ہو گیا ہے۔ لیکن ہمیں افسوس یہ ہے کہ بدنام کنندہ خود سب سے پہلے کھانے کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ بلکہ خود تیار کر کے اپنے ہاتھوں سے کھلاتے ہیں۔ افسوس یہ بدعقل ملا جواب دینے پر بھی قدرت نہیں رکھتا۔ شاید حلوے کی ہوس نے اس کی زبان پر تالے ڈال دیے ہیں۔

ہم نے جہاں تک لوگوں سے معلوم کیا ہے آخر یہ حلوا کس مد میں پکایا جاتا ہے تو اس کی چار وجوہات سامنے آئیں۔ جس سے یہ پتہ چلا کہ ان حلوا پکانے والوں میں سے ہر ایک کا نظریہ جداگانہ ہے۔ اس لیے اس سلسلہ میں کوئی ایک فیصلہ ممکن نہیں۔ اس لیے ہم ذیل میں ہر طبقہ کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔

(۱) ایک نظریہ یہ ہے کہ اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے حلوا تیار کیا گیا تھا۔ اس لیے ہم حلوا پکا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیاز دیتے ہیں۔ یہ طبقہ حلوا نہ پکانے والوں کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دشمن تصور کرتا ہے۔ عام جہلا کو یہی تصور ہے۔

لیکن ہماری عقل سے یہ بات باہر ہے کہ حلوا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تیار ہو، اور کھا جائیں خود یا دوست احباب، پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کیسے پہنچا اور پکاتے وقت اس بات کا بھی احساس نہ ہو کہ جس مال سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے حلوا تیار کیا جا رہا ہے، وہ مال حلال ہے یا حرام۔ کیونکہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ راشی، سود خور، جواری، بے ایمان، ڈاکو، غاصب اور اسمگلر سب ہی حلوا پکاتے ہیں۔ اگر اس سے غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کریمہ ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اس سے بدترین کیا مذاق ہوگا کہ جس مال کے کھانے سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کیا ہے۔ وہی مال حضور کو پیش کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا یقبل اللہ صدقۃ من غلول (مسلم ج ۱، ص ۱۱۹)

''اللہ حرام کا صدقہ قبول نہیں فرماتا۔''

اس قسم کے لوگوں کو محب رسول کہنا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی زبردست توہین ہے۔ اس قسم کے لوگ حضور ﷺ کے بدترین دشمن ہیں۔ اگر حلوا صدقہ کی نیت سے پکایا جاتا ہے، تو اولین عرض تو یہ ہے کہ حضور ﷺ کے لیے صدقہ حلال نہ تھا۔ پھر صدقہ صرف غریبوں کا حق ہوتا ہے۔ نہ کہ برادری اور دوست احباب کا بلکہ کھاتے پیتے لوگوں کے لیے صدقہ کھانا حرام ہے۔ اس طرح سب حرام خوری میں مبتلا ہوئے۔ اور شریعت کا مذاق جداگانہ رہا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا﴾ (سورہ بقرۃ:۲۳۱)

''اور اللہ کی آیتوں کو ٹھٹھا نہ بنالو'' (ترجمہ احمد رضا)

ایک عرض یہ بھی ہے کہ جس شخص کے دانت ٹوٹ جاتے ہیں تو جب تک مسوڑھے بھر نہیں جاتے، اس کے لیے کھانا پینا دشوار ہوتا ہے۔ تمہاری منطق کی رو سے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کم از کم آٹھ دس روز حلوا پکاتے ۔لیکن تم نے نبی کو بھی ایک دن پر ٹرخا دیا۔ کیا اسی کا نام حب رسول ﷺ ہے؟

یہ بھی تمہیں معلوم ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے کے دو دانت شہید ہوئے تھے۔ جنہیں ثنایا کہا جاتا ہے۔ اور کھانا سامنے کے دانتوں سے نہیں کھایا جاتا، بلکہ داڑھوں سے کھایا جاتا ہے۔ افسوس کہ تمام زندگی کھاتے گزر گئی۔ لیکن انہیں آج تک یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ یہ کون سے دانتوں سے کھا رہے ہیں۔ قربان جائے اس سادگی کے۔

اس کا کیا ثبوت ہے کہ آپ حلوا کھانے کے لیے نبی کریم ﷺ جنت کی نعمتیں چھوڑ کر دنیا میں تشریف لاتے ہیں اور اگر بالفرض ایسا ہوتا بھی ہے تو کیا ہندو پاک اور ایشیا کے اکثر ممالک میں جو حلوا تیار کیا جاتا ہے۔ آپ اکیلے کھا لیتے ہیں۔ اس کے کھانے کے لیے تیس چالیس کروڑ افراد چاہییں غالباً آپ اسی مشکل کا تصور کرتے ہوئے خود ہی ہضم کر لیتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں چھلنیوں کا وجود نہ تھا۔ حتیٰ کہ حضرت سہل بن سعد انصاری ؓ کا بیان ہے کہ حضور نے تمام زندگی میں چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں دیکھی اور ہوتا یہ تھا کہ جو پتھر پر رگڑ کر ان کا بھوسہ پھونک سے اڑا دیا جاتا۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت

سہلؓ سے مروی ہے۔تو سرزمین عرب میں تو اس وقت تک گندم اور چھلنی کا بھی وجود نہ تھا۔تو یہ سوجی کا حلوہ کہاں سے آ گیا۔ یا حضور نے اسے کسی دوسرے ملک سے درآمد کرایا تھا۔ پھر یہ جمے ہوئے حلوے کیا دانت ٹوٹے ہوئے کھاتے ہیں۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔

یہ بھی یاد رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان مبارک جنگ احد میں شہید ہوئے۔ جو تمام مؤرخین کے نزدیک ۶ رشوال ۳ھ میں واقع ہوئی۔تف ہے ایسی عقل پر کہ دانت تو شوال میں شہید ہوں اور حلوا دس ماہ بیس دن بعد پکایا جائے یا تمہارے کہنے کا مقصود یہ ہے کہ ہم ایک ماہ بیس دن پہلے ہی پکا لیتے ہیں۔اس کا مقصد یہ ہوگا کہ تم پہلے سے اس روز بد کی آرزو کیے بیٹھے تھے۔قرآن نے اس قسم کے لوگوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

﴿يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِ﴾ (سورہ بقرہ:۲۷۵)

''اور وہ جسے آسیب نے چھو کر مخبوط بنا دیا ہو۔'' (ترجمہ احمد رضا)

② دوسرا نظریہ ہے کہ امیر حمزہ کی نیاز دی جاتی ہے۔اگر یہ نیاز ان کی شہادت کے باعث دی جاتی تو وہ بھی ۶ رشوال ۳ھ میں شہید ہوئے۔ پھر اگر یہ نیاز شہادت کے باعث ہے تو پھر ہر شہید کی نیاز دینی ہوگی اور اسلام میں اتنے لاتعداد افراد شہید ہوئے ہیں کہ ان کی نیاز کے لیے پاکستان کا بجٹ ناکافی ہوگا۔اگر آپ یہ فرماتے ہیں کہ ان کی صحابیت کے باعث یہ نیاز دی جاتی ہے۔تو صحابہ کرامؓ ایک لاکھ سے زیادہ تھے۔ان کی شب براءت کی نیاز بھی لازم ہوگی۔اگر آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ صحابی ہونا اور شہید ہونا یہ دونوں چیزیں شرط ہیں تو جنگ احد میں ستر صحابہ شہید ہوئے حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ بھی شہید ہوئے کیا آپ ان سب کی نیاز دیتے ہیں۔اگر آپ یہ فرماتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ہونے کے ناطے ان کی نیاز دیتے ہیں تو حضرت عباسؓ بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی نیاز کیوں نہیں دی۔ بلکہ چچا ہونے کے ناطے تو ابولہب کی بھی نیاز ہونی چاہیے تھی۔ہم تو یہ بھی سمجھنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ آپ لوگوں کو اپنی ناک بھی پکڑنی نہیں آتی۔دوسرے کی ناک آپ کیا پکڑیں گے۔

③ تیسرا نظریہ، یہ ہے کہ اویس قرنی کی نیاز دی جاتی ہے۔ کیوں کہ انہوں نے جب سنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہو گئے تو انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ کون سے دندان مبارک شہید ہوئے ہیں اس لیے انہوں نے اپنے تمام دانت توڑ لیے۔ یہ بات جداگانہ کہ اُس دور میں جب کہ نہ ڈینٹسٹ کا کوئی وجود تھا اور نہ ہی زنبور پائی جاتی تھی پورے دانت کیسے توڑے گئے ہونگے؟ ہمیں افسوس صرف اس امر کا ہے کہ یہ کہانی بیان کرنے والوں میں سے کسی نے آج تک اپنا ایک دانت بھی نہیں توڑا۔ جب آپ اس کہانی پر عمل نہیں کرتے تو منکرین کے سامنے یہ کہانی پیش کرنے سے کیا حاصل۔ یہ دعویٰ اور یہ بدعملی آپ کی منافقت کا کھلا ثبوت ہے۔

اویس قرنی کے بارے میں جتنی بھی روایات ملتی ہیں وہ اکثر جھوٹی ہیں۔ بلکہ بعض آئمہ محدثین کو ان کے وجود میں بھی شک ہے، امام مالک اور امام شعبہ سرے سے ان کے وجود کے منکر ہیں۔ بلکہ امام شعبہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ میں نے عمرو بن مرہ تابعی سے جو قرن کے باشندہ تھے اور اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جس قبیلے کے اویس بیان کیے جاتے ہیں دریافت کیا کہ تمہارے قبیلے میں یہ اویس نامی کون شخص گزرا تھا تو انہوں نے جواب دیا ہمارے قبیلے یا ہماری بستی میں اس نام کا کوئی فرد نہیں گزرا۔ تو اگر یہ حقیقت ہے تو پھر کیا ایک فرضی وجود کی نیاز دی جاتی ہے؟

تاریخی طور پر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ یمن کا علاقہ ۱۰ھ میں فتح ہوا۔ اگر اویس کا کوئی وجود تھا تو ظاہر ہے کہ وہ ۱۰ھ میں مشرف بااسلام ہوئے ہوں گے۔ جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان مبارک ۳ھ میں شہید ہوئے۔ اس طرح یا تو انہوں نے یہ دانت حالت کفر میں توڑے ہیں تو ایک کافر کے فعل سے ہمارا کوئی تعلق نہیں اور اگر حالت اسلام میں توڑے ہیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل یمن کی تعلیم کے لیے اولاً حضرت علیؓ، حضرت ابوموسی اشعریؓ اور معاذ بن جبلؓ کو مامور فرمایا۔ اویس ان حضرات کے ذریعے یہ معلوم کر سکتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کون سے دانت شہید ہوئے ہیں۔ پھر اہل یمن کی اکثریت انہی حضرات کے ہاتھوں پر اسلام لائی اور ان حضرات سے یمن میں تعلیم حاصل کی۔ ان میں اویس کا کوئی ذکر

نہیں۔اگر وہ عمداً ان حضرات کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے تو اس سے زیادہ بدقسمتی کیا ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ ایک مشہور صحابی ہیں جو ہمیشہ روزے رکھتے، اور تمام رات تلاوت کلام اللہ کرتے۔لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

لم عذبت نفسک (ابوداؤد ج/۱،ص/۳۳۷)

''تو نے اپنی جان کو کیوں عذاب دیا۔''

پھر فرمایا:

ان لنفسک علیک حقاًو لعینیک حقاً(بخاری ج/۱،ص/۳۶۷۔مسلم ج/۱ ص/۳۶۷ ونسائی ج/۱،ص/۲۳۸)

''تجھ پر تیری جان کا بھی حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی حق ہے۔''

یعنی یہ بھی ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنی جان اور اپنی آنکھوں کو آرام دے اور انہیں عذاب نہیں دے اور جب شب بیداری اور عبادت کر کے آنکھوں کو عذاب دینا جائز نہیں تو بلا وجہ دانتوں کو عذاب دینا کیسے جائز ہوگا۔حالانکہ عبداللہ بن عمروؓ کا مقصود عبادت تھی عذاب دینا نہ تھا۔لیکن بلا ارادہ آنکھوں کو تکلیف پہنچ رہی تھی۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی۔

اس صورت میں ارادتاً دانتوں کو عذاب دینا یہ حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں، بلکہ عداوت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔اللہ تعالیٰ ہمیں نادان دوستوں سے محفوظ رکھے۔یہ بھی شریعت کا ایک مسلمہ قانون ہے کہ خودکشی حرام ہے۔جس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی جان کا خود مالک نہیں۔بلکہ یہ جان دراصل اللہ کی ملکیت ہے اور خودکشی اللہ کی ملکیت میں دخل اندازی ہے تو جب جان اللہ کی ملکیت ہے اور اسے ضائع کرنا حرام ہے تو اسے کسی صورت میں نقصان پہنچانا بھی حرام ہوگا۔

اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تیری آنکھوں کا تجھ پر حق ہے اور ہر چیز کا حق ادا کیا کر تو دانتوں کا بھی انسان پر حق ہوا۔اسی لیے ان کی صفائی کا حکم دیا۔تو جو شخص اپنی آنکھیں خود ضائع کرتا ہے یا

دانت خود توڑتا ہے تو وہ سزا کا مستحق ہے۔ نہ کہ تعریف کا یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین میں سے کسی نے بھی اپنے دانت نہیں توڑے۔ اویس کے بارے میں یہ کہانی ہمیں آج تک کسی تاریخی کتاب میں نظر نہیں آئی۔ ہاں صوفیاء کی کتابوں میں ضرور نظر آتی ہے۔ مثلاً ''کشف المحجوب'' اور ''تذکرہ اولیاء'' وغیرہ۔ لیکن یہ حضرات تاریخ سے اتنے نابلد ہیں کہ اگر تاریخی غلطیاں پکڑی جائیں تو کئی جلدیں تیار ہو جائیں۔ تصوف کی کتابیں پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ تصوّف جہالت کا دوسرا نام ہے۔

④ بعض لوگ صرف رسماً اور دیکھا دیکھی پکاتے ہیں۔ گویا یہ عملی طور پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری حالت بھیڑوں سے کم نہیں۔ لیکن ہم نے ان میں سے آج تک کسی کو کنوئیں میں دیکھا دیکھی گرتے نہیں دیکھا۔ ان کو غرض صرف دکھاوا ہوتی ہے اور ریاکاری اور دکھاوا خود حرام ہے اور اگر یہ مال حرام سے تیار ہوا ہے تو پھر اس پر دو حرمتیں جمع ہوں گی۔ اور سب سے بڑا جرم یہ ہوگا کہ دوسرے جو بری نیت سے یہ کام انجام دے رہے ہیں۔ اس میں عملی طور پر انکی مدد ہو رہی ہے۔ ان میں سے ہر شخص اسکا منتظر رہتا ہے کہ کب دوسرے کے گھر سے حلوا آئے تو اسکے گھر بھیجا جائے اور جس گھر سے حلوا نہ آتا اسے ذلیل تصور کیا جاتا ہے اور جو شخص حلوا واپس کر دیتا ہے اسے اپنا دشمن تصور کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ حلوا بھیجتے وقت یہ نہیں دیکھتے کہ کون مستحق ہے بلکہ یہ بھی اپنی برادری اور دوست احباب کو پیش نظر رکھتے ہیں اور ہر ایک کے گھر حلوے کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ اس طبقہ فکر کے لوگوں کا مقصود دین نہیں ہوتا صرف دنیاداری اور دکھاوا مقصود ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ اکثر اسی مرض میں مبتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہر مرض سے محفوظ رکھیں آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

حبیب الرحمان کاندھلوی۔ جولائی ۱۹۸۲ء